کشمیر کے شب و روز

پیارے لال کول
(ایڈوکیٹ)

ناشر

سن پبلکیشنز
سہیار سرینگر - ۲
۶۳ - گوکھلے مارکیٹ دہلی - ۶

کشمیر کے شب و روز

بار اوّل
مارچ سنہ ۱۹۷۲ء
قیمت:۔ مجلد پانچ روپے

نیو کشمیر پرنٹنگ پریس سرینگر میں
پی۔ایل۔کول نے طبع کرا کے
شمع پبلیکیشنز سہہ یار
سرینگر ۔۲ سے شایع کیا۔

میرے ایک زمانے کے لیڈر
خواجہ محمد عمر بٹ مرحوم
کی نذر
جنہوں نے ہمیشہ میری بیباکی اور سرکشی
کی خطاؤں اور باغیانہ اداؤں
کو درگذر کیا
اور مجھے پیار و شفقت بخشا۔
مقابلتاً کم سن ہو کر بھی مجھے
عزت و احترام اور قدر دانی کا
امتیاز عطا کیا۔
پیارے لال کول

اگر گویم زبان سوزد
نہ گویم جگر سوزد

کشمیر کے شب و روز

فہرست

صفحہ

پیش لفظ

ہندوستان کے سرے پر واقع ریاست جموں و کشمیر رقبہ کے لحاظ سے غیر منقسم ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست تھی۔ ۱۹۴۷ء میں ریاست جموں و کشمیر نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کیا۔ آج کل اس کا ایک تہائی حصہ پاکستان کے قبضہ میں ہے۔

ہندوستان کے اس شمالی حصہ کو جہاں قدرتی مناظر اور خوبصورتی کی بدولت شہرت حاصل ہے۔ وہاں فوجی نقطہ نظر سے بھی اس کی کافی اہمیت ہے۔ لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود ریاست جموں و کشمیر کی حالت اطمینان بخش نہیں ہے ایک طرف یہ بین الاقوامی سازشوں کی آماجگاہ بن جاتی ہے تو دوسری طرف یہاں کے لوگ وقت وقت پر پردہ آہنی کے پیچھے کراہتے رہے ہیں۔ ساری ریاست ایک وسیع سیاسی قبرستان میں بدل دی گئی ہے۔ جہاں عوام کا ذہن سپرد خاک ہوکر انسانی عظمت اور سیاسی شعور کی روح سسکیاں لے رہی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں "عوامی راج" کے انعقاد سے ریاست جموں و کشمیر میں روشن دور کی سنگ بنیاد پڑ چکی تھی۔ لیکن ریاستی حاکمان نے، وقت وقت پر اس کو ایسے دور میں بدل دیا۔ کہ قرون وسطیٰ کے کشمیر کا عکس جمیل نظر آیا۔ اس دور حکومت کے پیلیشرد مسٹر شیخ محمد عبداللہ ہیں۔ جن کے جانشینوں میں مسٹر بخشی غلام محمد اور مسٹر غلام محمد صادق اپنے اپنے اقتدار کی خاطر ایسے حالات قائم رکھنے میں درپردہ طور کوشاں رہے ہیں۔ جو لوگوں کی بے چینی کا سبب بن کر ہندوستان کے تئیں کسی حد تک بدظنی پھیلانے کا باعث بنے تاکہ یہ اقتدار پرست اپنے کو ہندوستان کے واحد غمخوار و ہمدرد جتلا کر اقتدار حاصل کرنے یا برسر اقتدار رہنے کیلئے مرکزی سرکار کے سامنے جوازیت پیدا کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا طرز عمل ہندوستان کو ایسے اقتدار پرستوں کی نازبرداریاں منوانے پر مجبور کرنے کی ایک چال رہی ہے۔

وقت وقت پر فرقہ پرستی اور صوبہ پرستی، کو ہوا دی جاتی ہے۔ یہاں

تک کہ ملازمتوں میں بھرتی اور ایڈمنسٹریشن چلانے میں بھی اس سے کام لیا جاتا ہے
لوگ فرقہ پرستی کی طرف جانے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ جس سے ملک دشمن عناصر اور پاک
نواز رہنماؤں کو تقویت مل رہی ہے۔ ایک بار مجھے اپنی پارٹی کے ایک مسلمان سا
نے بتایا کہ

"صاحب اقتدار گروہ اپنے ذاتی اغراض اور مفاد کیلئے ہندوستان کا علمبردار
بنا ہے لیکن مجھ جیسے مسلمان کسی لالچ کے بغیر ہندوستانی ہیں اور ہندوستان
کے غمخوار ہیں۔ پھر بھی ہم کو ابھرنے کا موقع نہ دے کر دبانے کی کوشش
کی جاتی ہے"

حق تو یہ ہے کہ یہاں کسی صحت مند تحریک کو آگے بڑھنے کا موقع ہی نہیں د
جاتا ہے۔ جس وجہ سے یہاں غیر یقینی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ایسی صورت
حال ہمیشہ برسر اقتدار ٹولی کی بقا کا باعث بن جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ حکومت
ہند ہمیشہ ریاست کے برسر اقتدار ٹولے کے سامنے بے بس اور مجبور بنتی ہے۔ جب
تو اس کو آسانی کے ساتھ لگام نہیں دی جاتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ
ریاستی عوام ہندوستان کے حق میں ہونے کے باوجود حکومت ہند سے متنفر اور بدظن
ہوئے جاتے ہیں۔ ریاستی عوام کا جو اعتماد ہندوستان پر ہے اس کو متزلزل کرنے
کی ہمیشہ کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ یہاں کے لوگ بے شک اپنے ہموطن ہندوستانی
بھائیوں کے دوش بدوش آگے بڑھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ
ہی ناقص اور نااہل حکومت سے چھٹکارا پانے کی چاہ بھی رکھتے ہیں۔

ان تمام باتوں کا نتیجہ انجام کار ریاست اور باقی ہندوستان کیلئے بہت ہی
خطرناک بھی ہو سکتا ہے اور ہوا بھی۔ اس کی ذمہ داری ہندوستان کی کانگریسی
حکومت اور مقامی حکمرانوں پر عائد ہوگی۔ اس کی پیشبندی آج ہی سے ہو تو بات
بن سکتی ہے۔ ورنہ حالات کے ابتر ہو جانے کا قوی احتمال ہے۔ برسر اقتدار
گروہ کی ذاتی مصلحتوں اور مرضی پہ قوم اور ملک کے مفادات قربان نہیں کئے جا
سکتے ہیں۔ اور نہ وہ اپنے ذاتی اقتدار اور مصلحتوں کی بناء پہ تلخ حقائق کا اظہار کرنے
والوں کو انتقام لینے کی غرض سے زیادہ دیر تک کچل سکتے ہیں۔

میرا یہ کشمیر وہ کشمیر ہے۔ جہاں لاء اینڈ آرڈر کا وقار نہ جمہوری روایات کا
احترام ہے۔ جہاں عصمت اور ننگ و ناموس کی تقدیس نہیں ہے اور نہ ہی مال

ع اور انسانی زندگی اور عظمت کا تحفظ ہے۔ وہاں وہ کشمیر حسن کا بے داغ حسن
جس کی شادابی و رعنائی سارے جہاں میں مشہور ہے۔ لیکن جہاں عوامی آواز کی
نہیں۔ اور جہاں کے عوام کی قضا و قدر چند آدمیوں کے ہاتھوں میں رہتی آئی
۔ اُف! ایک طرف فطرت کے رنگ و بو کا حسین امتزاج اور دوسری طرف
قی عوام کے مرجھائے چہروں کا اضطراب انگیز تضاد! ہزاروں سیاح ہر سال یہاں
ہیں۔ لیکن قدرت کی رنگینی کا حظ اٹھانے والے، یہاں کے معطر پھولوں
بھینی بھینی خوشبو سے لطف اندوز ہونے والے، یہاں کے حیات بخش چشموں
اپنے ہونٹوں کو تراوت بخشنے والے یہاں کی دوشیزۂ فطرت کے حسین رخساروں
چومنے والے سیاح یہاں کے عوام کی پژمردگی اور اضطرابی کیفیت کو کیا جانیں گے؟
ر سے قدرت کا حسن تو نکھر کر ان پر نمودار ہے۔ لیکن عوام کے دل کی دھڑکنیں تو
ں پر عیاں نہیں ہیں۔ واضح نہیں ہیں۔ اور ان ہی کچھ دھڑکنوں کو میں نے اس کتاب
سمونے کی کوشش کی ہے۔ اس امر کے باوجود بھی کہ یہاں کی بھیانک تصویر کی
پورے طور سے عکاسی کرنا بھی نہیں چاہتا۔ میرے کچھ ساتھی مجبور ہو کر دوسری
قتوں کے ساتھ مل گئے ہیں۔ اور کچھ تو دل برداشتہ ہو کر بالکل خاموشی اختیار کر
ے ہیں لیکن میں اسی جگہ پر ثابت قدمی سے قائم ہوں، جس جگہ میں اپنے مفادات
قربان کر کے عوامی اور ملکی خدمت کی لگن لے کر کھڑا ہوا تھا۔ میں اس میں شریک
ہیں ہو سکتا کہ کسی جماعت کو عوامی اور ملکی مفاد پر ڈاکہ ڈال کر حکمرانوں نے اقتدار کی
لئے استعمال کیا جائے۔ میں اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے سے کبھی جھجک
وس نہیں کروں گا۔ اپنی جگہ پر میں تیز و تند طوفانوں کا مقابلہ کرنے کیلئے مضبوطی سے
ڑا ہوں اور اب تک لالچ یا دباؤ سے بے نیاز ہو کر مصائب جھیلتا آیا ہوں۔ ناملائم
پٹوں سے میں کبھی گھبرایا نہیں۔ اپنے فرائض کی ادائیگی سے میں کبھی ہچکچایا نہیں۔
ی کا بین ثبوت یہ کتاب ہے۔ عوام کی کچھ آہیں اور کچھ آنسو ہیں جو اس کتاب
سمیٹ لئے ہیں۔ اور یہی مرقع کشمیر کی حسین وادی سے میں نظر نو برد رہا ہوں۔
مستقبل کا مورخ اس سے استفادہ کر کے کشمیر کے اس دور کے واقعات کا
یح اندازہ اور تجزیہ کر سکے۔
کشمیر کے واقعات سے براہِ راست واقف نہ ہونے والے افراد کو زیر نظر
تاب کے مطالعہ سے یہاں کے حالات کی کچھ نہ کچھ جانکاری ضرور حاصل ہو

جائیگی۔ لیکن ریاست کے متعلق مزید حقائق جاننے کیلئے میری دوسری زیر تصنیف کتابوں کا مطالعہ بھی خالی از دلچسپی نہیں ہوگا۔ اس طرح سے قارئین کو ریاست جموں وکشمیر کے حالات اور واقعات کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔ میں نے زیر نظر کتاب میں کچھ باتوں اور موضوعات پر سیر حاصل بحث نہیں کی ہے۔ ان امور پر میں مزید اور مفصل روشنی اپنی دوسری کتابوں میں ڈالوں گا۔

زیر بحث کتاب غیر جانبدارانہ نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے۔ تاکہ یہاں کے حالات کی صحیح صورت گری ہو۔ اور ملکی عوام کے سامنے یہاں کی اصلی تصویر آجائے جس کی نسبت ملکی اخبارات میں کم ہی بلکہ شاذ ہی کوئی جگہ ملتی ہے۔ یہ کتاب ایک قسم کا خود تنقیدی جائزہ ہے اور یہاں ایسی کتاب کو منظر عام پر لانا آسان نہیں ہے۔ اصل میں یہ کتاب بخشی دور حکومت میں لکھی گئی تھی لیکن بعض وجوہات اور مجبوریوں کی بنا پر طبع نہ ہو سکی۔ بہر حال کچھ ضروری ردو بدل کے ساتھ اب یہ کتاب نظر نواز کرنے میں کامیاب ہو رہا ہوں۔ اہم تبدیلیاں کر کے اس کتاب کو حالات حاضرہ کے سانچے میں ڈھال دیا گیا ہے تاکہ قارئین کی دلچسپی کتاب میں قائم رہے۔ اس لئے حالات حاضرہ کیساتھ مطابقت رکھتے ہوئے اسے تازہ کتاب تصور کیا جانا چاہیئے۔

نواکدل، سرینگر ۲
جنوری سنہ ۱۹۷۲ء

پیارے لال کول
(ایڈوکیٹ)

تذبذب اور الجھنیں

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء میں جب برِ صغیر ہندوستان کو طوقِ غلامی سے نجات ملی۔ اور ملک کے بٹوارے کی صورت میں پاکستان کا وجود پہلی بار نقشہ عالم پر آیا۔ تو مطلق العنانیت کے خلاف جدوجہد کے دوران ریاست جموں و کشمیر کے بکھرے ہوئے گیسو بھی سنورنے لگے اور ہندوستان کے ایک حصہ کے اوپر مطلق العنانیت کی تاریکی میں یہاں عوامی راج کی روشنی پھیل گئی۔ عوامی حکومت کے پہلے سربراہ اور وزیر اعظم مسٹر شیخ محمد عبداللہ مقرر ہوئے لیکن جس حسین خواب کو اس دوشیزۂ آزادی کے خط و خال کو تراشا اور سنوارا تھا۔ وہ محبوب صورت صناع کے بے باکانہ انداز اور بے باکانہ روش سے مسخ ہونے لگی۔

اس دور میں پاکستانی حملہ کے نتیجہ میں کشمیر کا سنگین مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ جسے ہند سرکار کی ناعاقبت اندیشی اور سیاسی تدبر کے فقدان کی وجہ سے بین الاقوامی اہمیت عطا ہو گئی۔ اس لئے شیخ وزارت کا دور ایک بحران کا زمانہ تھا۔ نیشنل کانفرنس کے ہاتھوں اقتدار منتقل ہونے کے ساتھ اس جماعت کے اراکین اپنے اپنے علاقوں میں نئے مطلق العنان حاکم بن گئے اور عوام کی سیاسی و علمی زندگی پر مسلط ہو گئے۔ اس طرح سے عوامی حکومت کے پردہ میں ایک نئی قسم کی مطلق العنانیت کے جراثیم پنپنے لگے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ایک مہاراجہ ہری سنگھ کشمیر کی حکومت سے دستکش ہو کر بمبئی کی کوٹھیوں کی زینت بنے لیکن اب سطح پر کئی چھوٹے مہاراجے پیدا ہو گئے۔ جو بہت حد تک مختلف محلوں اور علاقوں میں رہنے والوں کی قضا و قدر کے مالک بن گئے۔ کئی ایسے اصحاب پیچھے رہ گئے۔ جو ایمانداری سے حکمران جماعت نیشنل کانفرنس کے خیر خواہ، ہمدرد، معاون اور کارکن رہ چکے تھے۔ اور بہت سے ایسے افراد آگے آ گئے۔ جن کا اقتدار سنبھالنے سے پہلے نیشنل کانفرنس کے ساتھ کوئی سروکار نہیں تھا۔ یہ نچلی سطح پر اپنے علاقوں کے کرتا دھرتا بن گئے۔ فرقہ پرست ہندو اور پاکستانی مسلمان ہونے کا الزام دے کر کسی کو بھی وجہ بے وجہ ستایا جاتا۔ کسی بھی انتقام کا حساب چکایا

جاتا۔ بہت سے مسلمان سیاسی حریفوں کو محض اسی وجہ سے قید و بند کی صعوبتیں جھیلنا پڑیں اور طرح طرح کی مشکلات اور مصائب سے انہیں دوچار ہونا پڑا۔ میر واعظ مولوی محمد یوسف شاہ کے خاندان کے کچھ ممبران، اور مسلم کانفرنس کے کئی اراکین اس پالیسی کے خصوصی طور پر شکار ہوگئے۔ اسی طرح "کشمیر چھوڑ دو" تحریک کے دوران نیشنل کانفرنس حلقہ کمیٹی ڈیتل کے سیکرٹری شری پوشکر ناتھ کول وکیل (اب ریاستی ہندو مہا سبھا کے صدر ہیں) کو عوامی راج کے قیام کے بعد کئی دیگر افراد محلہ کے ہمراہ نئے اہلکاران حلقہ کمیٹی نے غیر سرکاری طور نیشنل ملیشیا اور پولیس کی امداد سے گرفتار کر لیا۔ اور حلقہ کمیٹی کے دفتر میں کئی دن محبوس اور مقید رکھا۔ قوم پرست اخبار ہفتہ وار "وکیل" سرینگر کی اشاعت غیر قانونی ہتھکنڈوں سے روک لی گئی۔ جس کے مالک اور مدیر پنڈت شمبھوناتھ کول مرحوم کو مہاراجہ ہری سنگھ کے دورِ حکومت میں شیخ صاحب اور بیگ صاحب نے خراج تحسین ادا کرتے ہوئے کہا تھا کہ اخبار وکیل اور اس کے ایڈیٹر نے کشمیر کی قوم پرست تحریک میں ایک نمایاں رول ادا کیا ہے لیکن شیخ وزارت میں اخبار وکیل کی پالیسی سے اختلاف کر کے حکومت نے سب سے پہلے اخبار "وکیل" کو موت کی نیند سُلا دیا۔

اقتدار سنبھالنے پر مسٹر شیخ محمد عبداللہ ایک زبردست ہندوستانی دیش بھگت اور پاکستان کے ایک عظیم مخالف کی صورت میں رونما ہوئے لیکن شیخ صاحب کبھی کسی سیاسی نظریئے پر ثابت قدمی سے ڈٹے نہیں۔ وہ دبی زبان میں اپنے موقف سے انحراف کرنے لگے۔ نتیجہ کے طور پر ۱۹۵۳ء میں ریاست جموں و کشمیر کی سیاست میں حد درجہ غیر یقینی پیدا ہوگئی۔ بحر سیاست میں نئے سرے سے ایک تلاطم پیدا ہونے لگا۔ کشمیر کی کشتی کے ناخدا مسٹر شیخ محمد عبداللہ موسم کی خرابی اور لہروں کے خوفناک تیور نہ بھانپ کر اپنے کرتب پر زیادہ بھروسہ کرنے لگے۔ لیکن بڑی مسافت طے کرنے کے بعد ہی کم حوصلگی کا شکار ہو کر کشتی کو طوفانی لہروں کے درمیان لا کھڑا کر دیا۔ ایک ہیجان پیدا ہوگیا اور غیر یقینی صورت حال نمودار ہوگئی۔ عوام میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ ایک طرف مسٹر شیخ محمد عبداللہ کشمیر کا سلطان بننے کا خواب دیکھ کر غیر ذمہ دارانہ تقاریر سے لوگوں کو ابھار رہے تھے تو دوسری طرف خود کابینہ کے ممبران اور نیشنل کانفرنس کے رہنماؤں میں باہمی اختلافات کی خلیج وسیع تر ہوتی جا رہی تھی۔ ریاستی

بساطِ سیاست پر نئی چالیں چلی جانے لگیں۔ اور ہر کوئی دھڑہ اپنے اقتدار کو بحال رکھنے اور زیادہ مضبوط بنانے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگانے لگا۔ شیخ صاحب ہند کے تئیں اپنی پالیسی سے انحراف کرنے لگے اور "آزاد کشمیر" کا خواب دیکھنے لگے۔ شیخ صاحب کی انقلاب نیت، پر ان کے اپنے رفقاء کو بھی حیرانی ہوگئی۔ جن میں سے کچھ تو شیخ صاحب کے اس ذہنی انتشار اور نئی سیاسی اچھل کود کو کشمیر کیلئے سود مند تصور نہیں کرسکے۔ چنانچہ جب اس بارے میں حکمران جماعت نیشنل کانفرنس کی مجلس عاملہ میں بحث و تمحیص ہوئی تو شیخ صاحب نے تنظیم کا لیڈر ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اقلیت میں پایا۔ مجلس عاملہ کے اندر اور اس کے باہر شیخ صاحب کے بالکل قریبی، دیرینہ اور قابلِ اعتماد ساتھیوں نے "نئے موقف" کی مخالفت کی اور یہی حال شیخ صاحب کا کابینہ میں بھی ہوا۔ صرف ایک وزیر مسٹر مرزا محمد افضل بیگ آخری وقت تک ان کے ہمنوا رہے۔ قدرتی طور پر برسرِ اقتدار جماعت اور حکومت میں ایک شدید اور نازک بحران پیدا ہوا اور عوام میں تذبذب اور انتشار کی کیفیت جڑ پکڑنے لگی۔ شیخ صاحب کی وزارت اعظمیٰ سے معزولی کے فوراً بعد اور وزیر اعظم بننے پر مسٹر بخشی غلام محمد نے ۹ر اگست ۱۹۵۳ء کو ایک نشریہ میں اعتراف حقیقت کرکے یوں حالات کا تجزیہ کیا:۔

"گذشتہ چند ماہ سے ہماری ریاست ایک شدید سیاسی اور معاشی بحران کا شکار بنائی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے ریاست کی وحدت اور یہاں کے عوام کا اتحاد خطرے میں پڑ گیا تھا...... بعض حالیہ واقعات نے انتشار انگیز عناصر کو یہ موقع دیا کہ وہ ہماری ریاست کے ٹکڑے ٹکڑے کردینے کی سفارش کرنے لگے۔ ہمارے بعض بچھڑے ہوئے ساتھیوں کے قول و فعل سے یہ ظاہر ہے کہ وہ ہماری ریاست کے ایک حصے کو الگ کرکے آزاد ریاست بنانے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ انہیں اپنی ان کوششوں میں بعض مفاد پرست بیرونی طاقتوں کی پشت پناہی حاصل تھی" [۱]

جو اصول کشمیر کی جمہوری تحریک کا سنگ بنیاد تھے۔ ان اصولوں اور جمہوری

---

[۱] بخشی غلام محمد کی ۹ر اگست کی نشری تقریر۔

طریقوں کو بالائے طاق رکھ کر بے چینی پیدا کر دی گئی تھی۔" کچھ عرصہ سے
ہم انتہائی کرب اور بے چینی کے ساتھ محسوس کر رہے ہیں کہ ہمارے پرانے
ساتھیوں نے ان اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اور حکومت اور نیشنل
کانفرنس کے دائرہ عمل میں تمام جمہوری طریقوں کا نام و نشان مٹا دیا ہے"[۱]
شیخ صاحب کے مخالف گروہ کی رہنمائی مسٹر بخشی غلام محمد نے کی۔ جو کہ شیخ
صاحب کی وزارت میں نائب وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز تھے۔ حکومت اور
نیشنل کانفرنس میں ان دو گروہوں کے درمیان ٹکر ناگزیر ہو گئی اور ریاستی عوام
کو تختہ مشق بنا کر ان کے اقتدار کی رسہ کشی کا شکار بنایا گیا۔ ان حالات میں بخشی
صاحب کا گروہ شیخ صاحب کے سابقہ قول و قرار کو برقرار رکھ کر ریاست جموں و
کشمیر کا ناطہ ہند یونین کے ساتھ بنائے رکھنا چاہتا تھا۔ شیخ صاحب کا دھڑا
ریاست کے حصے کرنا چاہتا تھا۔ شیخ صاحب ریاست کا پاکستانی مقبوضہ علاقہ
مستقل طور پاکستان کے ساتھ ہی نتھی کرنا چاہتے تھے اور جموں کو ہندوستان کی
عملداری میں رکھنا چاہتے تھے۔ اس کے عوض میں وادی کشمیر کو "آزاد" رکھ کر اس
کا مطلق العنان حاکم بننا چاہتے تھے۔ بہرحال دونوں دھڑوں کے پیچھے ذاتی اقتدار
اور جاہ و حشمت کا جذبہ کار فرما تھا۔

اس میں شک نہیں کہ لوگوں کی معاشی حالت ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ لوگوں
کی بدحالی کا خاکہ اس وقت تک کے نائب وزیر اعظم اور بعد کے وزیر اعظم مسٹر
بخشی غلام محمد نے اپنے نشریہ میں اس طرح کھینچا:-

"گذشتہ پانچ سال میں ہماری ریاست کی معیشت کو سنبھالنے کے سلسلے
میں بڑی کوتاہیاں ہوئی ہیں۔ جن کی وجہ سے کاروبار اور بہت سے پیشوں
کو شدید نقصان پہونچا ہے اور اس کے نتیجہ کے طور پر روزگار کے ذرائع
محدود ہو گئے ہیں۔ بے روزگاری پھیل رہی ہے۔ اور عوام کا معیار زندگی
بہت نیچا ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ نظم و نسق میں اہلیت، قابلیت
اور ایمانداری کا معیار بھی گر گیا ہے۔ اس کی وجہ سے حکومت پر سے
عوام کا اعتماد اٹھ گیا اور وہ یہ سمجھنے لگے کہ حکومت میں ان کے بنیادی

۱۔ بخشی غلام محمد کی ۹ اگست ۱۹۵۳ء کی نشری تقریر۔

معاشی مسائل حل کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے" ۱؎

وزارتی تبدیلی کے بعد نیشنل کانفرنس کا جو کنونشن ستمبر ۱۹۵۳ء میں منعقد ہوا۔ اس میں کنونشن کے کنوینر نے ریاستی حالات کا جائزہ لے کر اپنی افتتاحی تقریر میں کہا :-

" چھ سال ہوئے۔ حکومت ہمارے ہاتھوں میں آگئی۔ اس سے لوگوں نے سمجھا کہ اب وہ اپنی قسمت بدل سکتے ہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ سابقہ حکومت عوام کی ان توقعات کو پورا نہیں کر سکی اور لوگوں کی زبوں حالی روز بروز بڑھتی گئی۔ قیمتوں میں اضافہ ہوا۔ تعلیم مہنگی ہوگئی تنظیم میں انتشار پیدا ہوگیا۔ پروگرام پس پشت پڑا۔ اور اغراض پرستیاں سامنے آئیں۔ مظلوموں کی دادرسی نہ ہوئی اور قوم عام طور سے تباہ حالی کا شکار ہوگئی۔ قدرتی طور پر عوام نیشنل کانفرنس کی حکومت سے بدظن ہوگئے اور اس پر ان کا اعتماد ختم ہوا .... فضول اخراجات میں اضافہ ہوتا رہا۔ نتیجہ یہ کہ اس حکومت کے زوال کے دن قریب آگئے۔ سابق وزیر اعظم نے ان کوتاہیوں پر پردہ ڈالنے کیلئے "آزاد کشمیر" کا سوانگ رچایا اور سامراجی طاقتیں گدھوں کی طرح ہمارے وطن کے مطلع پر منڈلانے لگیں۔" ۲؎

متذکرہ صدر کنونشن میں جو سیاسی قرارداد منظور ہوئی۔ اس میں ریاست میں گھٹے ہوئے ماحول کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی گئی تھی۔

" عوام کی بڑھتی ہوئی معاشی بدحالی نے وسیع پیمانے پر ریاست کے طول و عرض میں بے چینی اور بے اطمینانی پیدا کی۔ عوام کے بیشتر حصہ کے افلاس میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اور حکومت ان کی امداد کے لئے کوئی موثر یا معقول طریقہ اختیار کرنے میں کوتاہی کر رہی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت پر سے عوام کا اعتماد اٹھ گیا اور وہ محسوس کرنے لگے کہ وہ انہیں ایک ہمدرد اور صالح نظام حیات نہ دے سکی"

۱؎ بخشی غلام محمد کی ۹ اگست ۱۹۵۳ء کی نشری تقریر۔

۲؎ نیشنل کانفرنس کا کتابچہ "ہمارا راستہ" صفحہ نمبر ۷ ، ۸

اُس وقت کی لیڈروں کا ذکر کرتے ہوئے قرار داد میں کہا گیا کہ :-

"وہ لوگوں کو ان سماجی اور اقتصادی مفاصار کا احساس دلانے میں ناکام ہوئے ہیں چنانچہ انہوں نے سیاسی مسائل کے بارے میں رائے عامہ کو منتشر کرنے کی کوشش شروع کی۔ نیشنل کانفرنس کے بنیادی اصولوں سے کلیتاً انحراف کرتے ہوئے انہوں نے مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے غیر ملکی مداخلت اور ثالثی پر تکیہ کرنا شروع کیا۔" ۵۱

قدرتی طور پر ریاستی عوام حکومت اور حکمران جماعت سے متنفر ہوئے۔ جموں میں شیخ وزارت کی آمریت کے خلاف پرجا پریشد نے ایجی ٹیشن شروع کردی تھی۔ وادیٔ کشمیر میں بھی لوگ کسی سیاسی جماعت کا سہارا لے کر حکومت کے خلاف شور و غوغا بلند کرنا چاہتے تھے۔ ملک بھر کا رائے عامہ شیخ وزارت اور ہندوستان کی کانگریسی حکومت کے خلاف ہونے لگا۔ اس سے دونوں حکومتیں متاثر ہوئیں۔ ریاستی حکمرانوں کو محسوس ہونے لگا کہ ان کی آمریت حد سے تجاوز کرنے لگی ہے اور آزاد رائے عامہ اس آمریت پر پابندی عاید کرنے کا موجب بن رہا ہے۔ نتیجہ کے طور پر شیخ صاحب نے اس دباؤ سے فرار ہونے کیلئے اور اپنے لامحدود آمرانہ اختیارات کو بحال رکھنے کیلئے ایک نئی چال سوچی۔ یہ چال ان کے ذہن میں پہلے ہی رچی ہوئی تھی۔ جو کہ "آزاد کشمیر" کے دبے نعرے کی صورت میں نمودار ہوئی۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ اس نئی اسکیم کے تحت شیخ صاحب کا یہ خیال تھا کہ ریاست کا پاکستانی مقبوضہ علاقہ پاکستان کو بخشا جائے اور جموں اور لداخ کو بدستور ہندوستان کے ساتھ رکھا جائے اور وادی کشمیر کو ہندوستان اور پاکستان کی گارنٹی کے ساتھ اور امریکہ کے بل بوتے پر آزاد رکھا جائے۔

ظاہر ہے کہ مسٹر شیخ محمد عبداللہ اپنے اقتدار اعلیٰ پر کوئی پابندی قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ ایک لامحدود اختیارات والے سلطان کی حیثیت میں نمودار ہو جانا چاہتے تھے۔ اسلئے وہ اپنی نئی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کیلئے ساز و باز کرتے لگے۔ ادھر سے حکومت ہند رائے عامہ کے خلاف ہو جانے کے ڈر سے اور ملکی مفادات کو زک پہونچنے سے بچانے کی غرض سے شیخ صاحب کی جگہ کسی

---

۵۱ نیشنل کانفرنس کا کتابچہ "ہمارا راستہ"

کی کرسی پر براجمان کرنے کی فکر میں رہی۔ اور اس
دوسرے شخص کو وزارت اعظمیٰ کی کرسی پر براجمان کرنے کی فکر میں رہی۔ اور اس
مقصد کیلئے مرکزی سرکار کے رہنما کسی دوسرے آدمی کے انتخاب کے تاک میں
رہے۔ اس صورت حال کو بھانپتے ہوئے کشمیر کے کئی سرکردہ مسلمان حکومت ہند
کا اعتماد حاصل کرنے کیلئے آگے آنے کی کوششوں میں رہے۔ حتیٰ کہ وزارتی تغیر
سے بہت عرصہ پہلے اور اس وقت کے ہندوستانی وزیر داخلہ ڈاکٹر کیلاش ناتھ
کاٹجو کے صاحبزادے پنڈت شیو ناتھ کاٹجو ایڈوکیٹ (جو آج کل الہ آباد ہائی
کورٹ کے جج ہیں) ریاست کے سیاسی حالات کا جائزہ لینے کیلئے وارد کشمیر
ہوئے تھے۔ اس موقع سے کئی مسلمان اصحاب نے فائدہ اٹھانے کی کوشش
کی۔ نیشنل کانفرنس کے برطرف شدہ کمیونسٹ نواز رہنما مسٹر غلام محی الدین قرہ
نے حکومت ہند کے بالائی ایوانوں میں ہند کے تئیں اپنی وفاداری کا ثبوت
پہنچانے کیلئے اس موقع کو غنیمت سمجھا تاکہ شری شیو ناتھ کاٹجو اپنے والد صاحب
تک قرہ صاحب کی بات پہنچانے کا وسیلہ بن جائے۔ شری شیو ناتھ کاٹجو
جب سرینگر بار ایسوسی ایشن میں مقامی وکلاء کے ساتھ یہاں کے سیاسی مسائل پر
بات چیت کرنے کیلئے آئے تو یہ بات چیت سرینگر بار کے بند کمرے میں ہوئی
اس موقعہ پر مسٹر غلام محی الدین قرہ نے بار ایسوسی ایشن کے صدر کی حیثیت میں
تقریر کرتے ہوئے منجملہ دیگر باتوں کے یہ بات بھی شری کاٹجو کے اشارے کے
کہی کہ ہندوستان کی دیگر ریاستوں کے مقابلے میں ریاست جموں و کشمیر کی
امتیازی پوزیشن بحال نہیں رہنی چاہئے۔ اور اس لحاظ سے ہندوستان کے
آئین میں دفعہ ۳۷۰ ایک تاریک ترین دفعہ ہے۔ اس خفیہ تقریر کی تفصیل
اخبار "وکیل" سرینگر مورخہ ۲۳ جون ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں اس کے
ڈپلومیٹک نامہ نگار شری مکھن لال امبار دار کے قلم سے شائع ہوئی جس
کا اقتباس درج ذیل کیا جاتا ہے:۔

"ہندوستان کا آئین پچاس سالہ جدوجہد کے بعد وجود میں آیا۔ اہل
ہند نے اپنے لئے صحیح، حقیقی اور مکمل جمہوریہ آئین بنایا ہے۔ اس
میں فرد کیلئے سبھی قسم کے شہری اور بنیادی حقوق موجود ہیں
اس قسم کی آزادی اور جمہور نوازی قابل تعریف ہے۔ لیکن
کشمیر کے لوگ جب آئین ہند کے اس شہری اور بنیادی حقوق کے

اعلان نامے کو دیکھتے ہیں۔ تو ان کے دل بھر آتے ہیں۔ اس اعلان نامے کا فیض اہل کشمیر کو حاصل نہیں۔ کیونکہ آئین مذکور کے دفعہ ۳۷۰ کی موجودگی میں آئین ہند کا یہ حصہ ریاست جموں وکشمیر پہ لاگو نہیں۔ یہ شہری اور بنیادی حقوق کشمیر کے لوگوں کو حاصل نہیں ہیں۔ باوجود اس کے کہ کشمیر ہند کا حصہ ہے۔"

"آپ نے کہا کہ آئین ہند میں دفعہ ۳۷۰ ایک تاریک ترین دفعہ ہے کیونکہ اسی دفعہ کی رو سے اگرچہ کشمیر کی ظاہرا طور پہ اندرونی معاملات کی خود مختاری INTACT رکھی گئی ہے۔ لیکن حقیقتاً یہی دفعہ ہمیں ان مراعات سے محروم رکھتی ہے۔ جو کہ آئین ہند کے شہری اور بنیادی حقوق کے اعلان نامے کی رو سے اہل ہند کو حاصل ہیں۔ آپ نے مزید کہا کہ ایک آئینی مورخ اس دفعہ کو ایک سیاہ دھبہ سمجھے گا۔"

"ہندوستان کی حکومت کی طرف رجوع کرتے ہوئے مسٹر قرہ نے کہا کہ حکومت ہند نے یہاں کے ایک محدود طبقے کے ساتھ تعلق پیدا کیا ہے۔ اور ایسا کرتے ہوئے انہوں نے یہاں کے عوام کو بالکل فراموش کیا ہے۔ حکومت ہند کو چاہیئے کہ وہ براہ راست عوام کے ساتھ تعلق پیدا کرے۔ کیونکہ اسی کا نام صحیح معنوں میں الحاق ہے اور عوام کی بڑھتی ہوئی ہمدردیوں اور خیر اندیشیوں سے وہ اسی طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ آپ نے کہا کہ حکومت ہند نے جس طبقے کے ساتھ تعلق رکھا ہے، وہ طبقہ اصل میں ہند کو بدنام کرتا ہے۔ اور بجائے فائدے کے نقصان کا باعث ہو سکتا ہے۔ ہند کی حکومت نے اس محدود طبقے کو اپنا کر اور اس کے ساتھ تعلق پیدا کر کے اصل میں سرزمین کشمیر کو بے آئین بنا دیا ہے۔"[۵]

اخبار "وکیل" میں اس خبر کی اشاعت سے ریاست جموں وکشمیر اور باہر کے سیاسی اور سرکاری حلقوں میں چہ میگوئیاں ہوئیں اور مسٹر غلام محی الدین قرہ نے جس رازدارانہ طریقے سے حقیقت بیانی کر کے کچھ باتیں

---

[۵] ہفتہ وار اخبار "وکیل" سرینگر مورخہ ۲۳ جون ۱۹۵۲ء

حکومت ہند کے بالائی حلقوں تک پہنچانے کا جو مقصد زیر نظر رکھا تھا۔ وہ پورا ہوتا ہوا نظر نہ آیا۔ مسٹر غلام محی الدین قرہ پاکستان کی حامی جماعت پولیٹیکل کانفرنس کے بانی صدر ہیں اور سابق وزیر اعلیٰ خواجہ غلام محمد صادق کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ مسٹر شیخ محمد عبداللہ نے خواجہ غلام محمد صادق کو اپنی وزارت سے علیحدہ کر دیا تھا۔ اور آئین ساز اسمبلی کے قیام کے بعد صادق صاحب کو اس کا پریذیڈنٹ منتخب کر دیا۔ پھر حال قرہ صاحب اور صادق صاحب کو ان کے تئیں روا رکھی گئی شیخ صاحب کی بے توجہی ایک آنکھ نہ بھائی۔ صادق صاحب نے آئین ساز اسمبلی کی صدارت مل جانے کو منسٹری کی کرسی چھن جانے کی بہت حد تک تلافی سمجھ لیا۔ لیکن پھر بھی وہ شیخ صاحب کی اس حرکت سے مطمئن نہ ہو گئے۔ گو کہ صادق صاحب ہندوستان کے ساتھ محدود الحاق کے حامی اس دوران میں بھی رہے ہیں۔ اور حالات کی نزاکت اور پیچیدگی کے باعث اسی کو واحد حل سمجھ کر شروع میں ہر آڑے وقت پر اس کا عملی ثبوت بھی دے دیا۔ لیکن تاہم وہ بھی دل سے ریاست جموں وکشمیر کو خود مختار رکھنے کی خواہش رکھتے تھے۔ اور وہ اس غرض کیلئے ریاست میں رائے شماری کرانا چاہتے تھے۔ لیکن مسٹر شیخ عبداللہ اور ان کے نقطہ نظر میں فرق یہ تھا۔ کہ مسٹر عبداللہ امریکہ کی امداد اور امریکہ کی نگرانی میں رائے شماری کرانا چاہتے تھے جب کہ صادق صاحب چین اور روس کی نگرانی میں اس کی تکمیل چاہتے تھے۔ صادق صاحب نے شیخ صاحب کی گرفتاری سے پہلے نیشنل کانفرنس ورکنگ کمیٹی کو مسئلہ الحاق سے متعلق جو نوٹ دیا تھا۔ اس میں اس خیال کی یوں جھلک ملتی ہے:۔

بے شک ایک نعم البدل ہے، جس سے اس مسئلہ کا جمہوری حل نکل آتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ساری ریاست میں رائے شماری کرائی جائے۔ ذاتی طور مجھے اس حل کے جمہوری کردار میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن میرا (بنیادی) اعتراض اس ایجنسی کے بارے میں ہے جو رائے شماری کرائے گی اور اس کی نگرانی کرے گی۔ اگر ایک ایجنسی مشتمل بر ہندوستان، پاکستان، افغانستان، روس اور چین رائے شماری کرائے اور اس کی نگرانی کرانے کیلئے قائم کی جا سکتی تو میں تجویز کرتا کہ ہمیں فوراً ساری ریاست میں رائے شماری کرانے کی مانگ کرنی چاہیئے۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو سکے تو ہم ایک نگران

کمیشن کا مطالبہ بھی کر سکتے ہیں، جس میں سلامتی کونسل کے ممبروں کے نمایندے شامل ہوں تاکہ ریاست میں آزاد اور غیر جانبدارانہ رائے شماری کی ضمانت مل سکے" ۔ ؎۱

قرہ صاحب تو اقتدار چھن جانے کے ماتم میں درپردہ پاکستان کا پروپیگنڈا کرنے لگے۔ لیکن موقع تاڑ کر شری کاٹجو کے ذریعے اپنے لئے راستہ صاف کرنے اور خفیہ طور اپنی وفاداری ظاہر کرنے کیلئے اس موقع کو موزوں و مناسب سمجھا لیکن کسی طرف سے حوصلہ افزائی نہ پاکر دل شکستہ ہو گئے۔ اس لئے وہ کسی دوسرے موقع کی تاک میں حالات کا جائزہ لینے لگے۔

"مسٹر غلام محی الدین قرہ نیشنل کانفرنس کے لیڈروں میں سے ایک رہے ہیں۔ ابتداء میں ہندوستان سے الحاق کی حمایت کرتے رہے لیکن جب صادق صاحب اور شیخ محمد عبداللہ میں کشیدگی پیدا ہوئی۔ تو قرہ صاحب خاموشی سے دہلی آئے۔ نیا بازار میں ایک فلیٹ پر "فرینڈز آف کشمیر سوسائٹی" کے کارکنوں کی ایک میٹنگ ہوئی۔ میں اس سوسائٹی کا صدر تھا۔ .... ہمیں انہی دنوں شیخ صاحب سے اختلاف ہوا۔ شری بلراج پوری قرہ صاحب کو دہلی لے آئے۔ اور قرہ صاحب نے کہا" اگر شیخ عبداللہ کو ہٹا کر شری نہرو مجھے وزیر اعظم کشمیر مقرر کردیں تو میں ہندوستان سے قطعی الحاق کا اعلان کر دوں گا۔ لیکن جبتک مجھے وزیر اعظم بنانے کا وعدہ نہیں کیا جاتا۔ میں الحاق پر کوئی بیان نہیں دوں گا۔ کیوں کہ مجھے اندیشہ ہے کہ شیخ صاحب کی سرکار مجھے گرفتار کرے گی۔ اور حکومت ہند میرے لئے کچھ نہ کر سکے گی۔ مسٹر قرہ تو اپنی صدقدلی کا ثبوت دینے کیلئے گاندھی جی کی سمادھی پر پھول چڑھانے کیلئے بھی گئے۔ انہوں نے شری نہرو سے ملاقات کی۔ واپسی پر انہیں سرینگر میں گرفتار کر لیا گیا۔ بعد میں ہم نے دیکھا کہ مسٹر قرہ بالکل بدل گئے اور انہوں نے پاکستان کے حق میں پروپیگنڈا شروع کر دیا" ؎۲

؎۱ شیخ صادق خط و کتابت صفحہ نمبر ۱۴ ؎۲ شری جے۔ ڈی۔ اختر کا مضمون بحوالہ اخبار "رہبر" سرینگر مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۶۴ء

ادھر سے بخشی غلام محمد اور مسٹر مرزا افضل بیگ کی آپس میں خوب ٹھنی تھی عوامی حکومت کے قیام کے بعد دو منسٹر کنبہ پروری اور جنبہ داری کیلئے خصوصی طور پر ریاستی عوام کی نظروں میں انگشت نما بن بیٹھے تھے۔ اور وہ ہیں متذکرہ صدر دو منسٹر صاحبان۔ ان دونوں نے اپنے رشتہ داروں اور واقف کاروں کو بے تحاشا اعلیٰ سرکاری عہدوں اور ترقیوں سے نوازا۔ کواپریٹو میں اور کواپریٹو سے باہر بڑے بڑے ٹھیکوں سے مالا مال کر دیا۔ فرق یہ تھا کہ دونوں اپنے اپنے ڈھنگ سے ایک دوسرے پر سبقت لینے کی کوششوں میں تھے۔ اور مشترک بات تھی تو یہ کہ دونوں وزراء صاحبان نے اپنی اپنی آمریت قائم کر رکھی تھیں۔

بیگ صاحب کا اپنا ڈسٹرکٹ، اننت ناگ گویا ان کے خاندان کی ذاتی مملکت تھا۔ ان کے تعلقداران محکمہ کواپریٹو پر تو بُری طرح چھائے ہوئے تھے شاید اس محکمہ میں سب سے زیادہ غبن بھی ہوئے۔ بخشی صاحب نے اپنے رشتہ دار مسٹر بخشی عبدالرشید کو ایک معمولی کلرک کی اسامی سے دیکھتے ہی دیکھتے محکمہ کواپریٹو کے ڈائریکٹر کے عہدے پر مامور کیا اور بعد میں نیشنل کانفرنس کا جنرل سیکرٹری بنالیا۔ اگرچہ بیگ صاحب ذہنی صلاحیتوں کے حامل ہیں تو بخشی صاحب تنظیمی صلاحیتوں میں ماہر ہیں۔ چونکہ بیگ صاحب ۹ راگست ۱۹۵۳ء کو ہی کرسیٔ اقتدار سے علیحدہ کئے گئے۔ اس لئے اس کے ساتھ ہی ان کی آمریت کا خاتمہ ہوا۔ لیکن بخشی صاحب ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۶۴ء تک دامن اقتدار کو پوری تندہی سے تھامے ہوئے تھے۔ اس لئے اس نامۂ اعمال میں ان کا نام سر فہرست ہی پایا جائے گا۔ لیکن خود شیخ صاحب کی ذات ان الزامات سے بالاتر رہی ہے۔ اور اس ضمن میں بے شک ان کا اُجلا دامن بے داغ رہا ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ کہ دونوں مسٹر بخشی غلام محمد اور مسٹر مرزا افضل بیگ۔ ہر ڈھنگ سے زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کرنے میں کوشاں رہے ہیں اقتدار کی اس ہوس سے متاثر ہو کر اندر ہی اندر ان دونوں میں ایکدوسرے کے خلاف برسرپیکار رہنے کا جذبہ موجزن ہونے لگا۔ شیخ صاحب کی ذات علیحدہ چھوڑ کر یہ دونوں اصحاب زیادہ سے زیادہ حصول طاقت کیلئے ایکدوسرے کی آمریت کے سامنے جھکنا نہیں چاہتے بلکہ ایک دوسرے کو گرانے کی تاک میں رہے۔

بخشی صاحب اور بیگ صاحب کی آپسی رسہ کشی کی بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ مسٹر افضل بیگ بخشی صاحب کا نائب وزیر اعظم ہونا اور خود ایک وزیر رہنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ مسٹر بیگ کا خیال تھا کہ حکومت ہند نے بخشی صاحب کی ناجائز حمایت کر کے ان کو نائب وزیر اعظم کے طور پر ٹھونسا۔ بیگ صاحب کا یہ بھی خیال تھا کہ وہ شیخ صاحب کے زیادہ نزدیک ہو کر مہاراجہ ہری سنگھ کے وقت نیشنل کانفرنس کی طرف سے "پاپولر منسٹر" بھی رہ چکے ہیں۔ اور اس لحاظ سے بخشی صاحب کے مقابلے میں وہی نائب وزیر اعظم بننے کے مستحق تھے۔ لیکن حکومت ہند نے بخشی صاحب کی غیر واجب حوصلہ افزائی کر کے ان کا حق مار لیا۔ اس کی تلافی کرنے کی غرض سے بیگ صاحب کے دل میں بخشی صاحب اور حکومت ہند کے تئیں انتقامی جذبہ موجزن تھا اور وہ اس صورت حال پر قابو پانے اور شیخ صاحب کے پاس اپنے آپ کو زیادہ قابل اعتبار ٹھہرانے کیلئے نئے حربوں کو استعمال کرنے لگے۔ آپ نے مسٹر شیخ عبداللہ کے دل میں ہندوستان کے خلاف سلگتی ہوئی آگ کو زیادہ بھڑکانا شروع کر دیا۔ اور ان کے ہر جائز و ناجائز قدم کی حمایت کر کے ان کے سب سے زیادہ قابل اعتماد مشیر اور لفٹننٹ بن گئے۔ بخشی صاحب کو اپنا راج سنگھاسن ڈولتا نظر آیا۔ آپ نے اگرچہ مسٹر شیخ عبداللہ کو اپنی وفاداری کا یقین دلانے کی ہر چند کوشش کی۔ لیکن شیخ صاحب کی رائے اب ان کے بارے میں بالکل بدل چکی تھی اور وہ بخشی صاحب کی ایک بھی سننے کو تیار نہ تھے۔ بلکہ اب وہ بیگ صاحب پر کافی بھروسہ کرنے لگے تھے۔ ۱۹۵۳ء کے وزارتی تغیر سے پہلے نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی نے جب کشمیر کے مسئلہ الحاق پر غور کیا تو بخشی صاحب اپنے اقتدار کی فکر میں اپنے آقا کے تیور پہچان کر ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ اور نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی میں وادی کشمیر کو ہندوستان کے ساتھ رہنے کی بجائے اس کو آزاد رکھنے کی دبی زبان میں حمایت کی۔ شیخ صاحب نے دوران اسیری جو چٹھی صادق صاحب کو ۲۶ ستمبر ۱۹۵۶ء کو لکھی۔ اس میں انہوں نے نیشنل کانفرنس ورکنگ کمیٹی کے آخری اجلاس منعقدہ ۹ جون ۱۹۵۳ء کی کارروائی میں سے مندرجہ ذیل اقتباس نقل کیا ہے :-

"مختلف میٹنگوں کے دوران جو بحث و مباحثے کئے گئے۔ ان کے نتیجہ کے طور پر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان قضیہ کشمیر کو

نپٹانے کے لئے صرف مندرجہ ذیل تجاویز ایسی نکلیں جن سے اس مسئلہ کا باعزت، پُر امن اور ممکنہ حل نکل آتا۔

(۱) سالم ریاست میں رائے شماری ان شرائط کے تحت کی جاتے جو ۴ر جون ۱۹۵۳ء کو منعقد کی گئی میٹنگ کی روئیداد کے مطابق ہو۔

(۲) سالم ریاست کی خود مختاری۔

(۳) خارجہ معاملات اور دفاع پر مشترکہ کنٹرول کے ساتھ سالم ریاست کی خود مختاری۔

(۴) ڈکسن منصوبہ کے تحت رائے شماری والے علاقہ کی خود مختاری۔

"بخشی صاحب اس خیال کے زبردست حامی تھے کہ متذکرہ صدر چوتھی تجویز کو اس قضیہ کا بنیادی واحد عملی اور فائدہ رساں اور باعزت حل قرار دیا جائے۔ [۱]

شیخ وزارت کے سارے ممبران شیخ صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے کابینہ کے اندر کھلے بندوں شیخ صاحب کے نظریہ کی مخالفت کرنے کی ہمت نہیں کرتے۔ شیخ صاحب نے مذکورہ چٹھی میں صادق صاحب کو اس بارے میں مزید لکھا ہے:-

"ہمیں سیاسی مسائل یا ان سے متعلق نظریوں پر کبھی اختلاف رائے نہیں تھا۔ در اصل ساری اہم خط و کتابت جو میرے زیر دستخطی مرکز کو جاتی تھی اس پر پہلے بحث کی جاتی تھی اور کیبنیٹ سے منظور کیا جاتا تھا۔ بے شک اختلاف اس وقت پیدا ہوا۔ جب میں نے پنڈت شیام لال صراف سے بار ہا انہوں کے سنگین الزام کے باعث استعفیٰ دینے کو کہا۔ شاید کیبنیٹ کے کچھ دوسرے ممبروں نے جنہیں اپنے قصور کا احساس تھا۔ اس سخت اقدام کی تائید نہیں کی" [۲]

مسٹر بخشی غلام محمد نے شیخ صاحب کی نبض بھانپ لی۔ اور محسوس کیا۔ کہ اپنی تمام کوششوں کے باوجود بھی وہ ان کو اپنے اعتماد میں نہیں لے رہے۔ بلکہ شیخ صاحب اب بخشی صاحب اور ان کے رشتہ داروں پر کڑی نظر رکھنے لگے۔ اور

---

[۱] شیخ صادق خط و کتابت صـ۱۷۔ [۲] شیخ صادق خط و کتابت صـ۱۸، ۱۹

مسٹر بخشی عبدالرشید (جو اُن دنوں نیشنل کانفرنس تحصیل کمیٹی سرینگر کے صدر اور آئین ساز اسمبلی کے ممبر بنا دیئے گئے تھے) کو خوب ٹوکا اور ان کے گھر بغیر فیس لگا ہوا ٹیلیفون منقطع کر دیا۔ ان سے نیشنل کانفرنس کی جیپ بھی چھین لی گئی۔ جس کو رشید صاحب اپنے ذاتی استعمال میں لاتے تھے۔ اس طرح سے بخشی صاحب اور ان کے اقرباء کو شیخ صاحب کے ساتھ ذاتی رنجش پیدا ہو گئی۔ اور وہ اپنی مملکت کو متزلزل ہوتا دیکھنے لگے۔ ان حالات میں ان کو اپنے اقتدار کو محفوظ رکھنے کی ایک ہی صورت نظر آئی۔ اور وہ تھی اس نازک صورت حال میں ہندوستانی سرکار کو اپنی خدمات پیش کر کے اور اپنی وفاداری جتلا کر اس کا اعتماد حاصل کرنے کا مظاہرہ کرنا۔ اس غرض کی تکمیل کیلئے بخشی صاحب اب شیخ صاحب کی ہند مخالف تقاریر کے برعکس ہندوستان کے حق میں تقاریر کرنے لگ گئے۔

مسٹر بخشی غلام محمد کے سامنے اب ایک اور غور طلب مسئلہ یہ تھا کہ جو کچھ چیدہ مسلم اصحاب حکومت ہند کو اپنی خدمات کی پیشکش کر کے اقتدار سنبھالنے کی غرض سے میدان میں آنا چاہتے ہیں۔ ان سے ہوشمندی سے نپٹ کر انہیں اپنی راہ سے ہٹا لیا جائے۔ کیونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں حکومت ہند کی نظر انتخاب کسی اور پر نہ پڑے۔ اور کہ کسی دوسرے کو ان کے مقابلے میں ابھرنے کا موقعہ نہ ملے۔ مسٹر شیخ عبداللہ کے نئے طرز عمل کی وجہ سے ان کے حکومت سے علیحدہ کئے جانے کا امکان پیدا ہوا تھا اور ایسے خلاء کو پر کرنے کیلئے کسی قابل اعتماد شخص کا انتخاب ناگزیر بن گیا تھا۔ اس لئے بخشی صاحب اپنے لئے راستہ صاف کرنے کی سوچ رہے تھے۔ شیخ صاحب کے ناراض شدہ ساتھی خواجہ غلام محمد صادق اور مسٹر غلام محی الدین قرہ اس رسہ کشی کی صف اول میں تھے۔ اس لئے بخشی صاحب کی کڑی نظریں ان پر تھیں۔ چونکہ قرہ صاحب عوام میں اپنی دو رخی پالیسی کے طشت از بام ہو جانے سے عجیب الجھن میں پھنس گئے تھے۔ اس لئے وہ اپنی پوزیشن کی وضاحت کرنے کی خاطر کوئی واضح موقف اپنانا چاہتے تھے۔ مسٹر شیخ عبداللہ کی غیر ذمہ دارانہ تقاریر سے یہاں کی سیاسی فضا اس وقت بالکل مکدر ہو چکی تھی اور انتہائی غیر یقینی حالات رونما ہو چکے تھے۔ قرہ صاحب ایسے وقت کو موزون سمجھ کر اپنے لئے کوئی نہ کوئی راستہ اعلانیہ طور متعین کرنا چاہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ تذبذب کے ان حالات میں بخشی صاحب نے قرہ صاحب کو یہ خفیہ پیغام بھجوا

دیا کہ حالات بدل گئے ہیں اور کشمیر میں ہندوستان کی عملداری کا خاتمہ ہوا جا رہا ہے۔ شیخ صاحب آزاد کشمیر کی طرف جا رہے ہیں۔ آپ ان سے بھی ایک قدم آگے جاکر وقت کا بہترین فائدہ اٹھائیں۔ اور ایک تنظیم بنا کر اور مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ابھار کر پاکستان کا نعرہ بلند کریں۔ یہ پیغام سن کر مسٹر قرہ خوش تو ہوئے لیکن حیران بھی حیران اس لئے ہوئے کہ اب تک کشمیر میں اس طرح سرعام کوئی حکومت کی مخالفت کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ خود قرہ صاحب اتنی مدت تک ایک بے بس تماشہ بین بنے رہے۔ تو پھر یہ کیسے ممکن ہو سکتا۔ کہ اس طرح سے حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے منظم طریقے پر پاکستان کا نعرہ بلند کیا جا سکتا۔ اس لئے قرہ صاحب اب بھی ایسا اقدام کرنے کی ہمت نہیں کر سکے۔ ورنہ ممکن ہے کہ انہوں نے بہت عرصہ پہلے ایسا قدم اٹھایا ہوتا۔ اگرچہ مسٹر شیخ عبداللہ ہندوستان کے خلاف زہر پھیلانے لگے تھے۔ لیکن وہ کسی دوسرے کو میدان مارنے کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔ تاکہ ان کے اختیار اعلیٰ اور ان کی لیڈر شپ کو چیلنج کرنے والا کوئی نہ جم جاتا۔ اس لئے قرہ صاحب کیلئے یہ مشورہ ذہنی پریشانی کا باعث بنا۔

واقف کار حلقوں کا بیان ہے۔ کہ اس مرحلہ پر مسٹر بخشی غلام محمد نے دوبارہ مسٹر غلام محی الدین قرہ کو اشارہ دیا کہ وہ ایک پاکستان حمایتی جماعت کو تشکیل دے کر اس کا کھلم کھلا اور باضابطہ اعلان کریں اور اس بارے میں بغیر کسی پابندی کے پبلک جلسہ بھی منعقد کریں۔ اور جلسہ میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے گی۔ چونکہ بخشی صاحب گھریلو معاملات یعنی لاء اینڈ آرڈر کے منسٹر تھے۔ اس لئے انہوں نے اس سکیم کو عملی جامہ پہنانے کیلئے ساری مراعات قرہ صاحب کو دیدیں۔ مسٹر بخشی غلام محمد اس طریقہ سے جہاں مزید افراتفری پیدا کر کے حکومت ہند پر دباؤ ڈالنا چاہتے تھے۔ وہاں اپنی راہ میں حائل شدہ کانٹوں کو ہٹا کر اپنے لئے راستہ صاف دیکھنا چاہتے تھے۔

مسٹر قرہ نے ہندوستان کے تئیں وفاداری ظاہر کر کے اقتدار حاصل کرنے کے بیل منڈھے نہ چڑھتے دیکھ کر مذکورہ صدر تجویز کو زیادہ فائدہ مند سمجھا۔ اور اس خیال میں مبتلا ہو گئے کہ بخشی صاحب بھی وقت پر اپنا پینترا بدل لینے کی تاک میں ہیں اور شاید اسی لئے ان کو اعتماد میں لے کر انہوں نے ایک ایسی جماعت کو پہلے ہی تشکیل دینے کی ترغیب دیدی ہے۔ قرہ صاحب کا یہ

بھی خیال تھا کہ غالباً بخشی صاحب مسٹر شیخ عبداللہ سے ٹکر لینے کیلئے وقت پڑنے پر آزاد کشمیر کا نعرہ دینے کی بجائے صاف طور پر پاکستان کی حمایت کریں گے۔ چنانچہ اس خیال آرائی سے مسٹر غلام محی الدین قرہ کا حوصلہ بندھ گیا۔ اور اس مقصد کے لئے باضابطہ ایک جماعت موسومی "کشمیر پولیٹیکل کانفرنس" کا قیام عمل میں لایا۔ اس تنظیم کا فوراً ہی ایک بہت بڑا تاریخی پبلک جلسہ ۱۹ جون ۱۹۵۳ء کو محلہ سہیار سرینگر میں منعقد ہوا۔ اس طرح سے ۱۹۴۷ء کے بعد کشمیر کی تاریخ میں پہلی بار منظم طریقے پر پاکستان کے حق میں پلیٹ فارم سے بلا روک ٹوک آواز اٹھائی گئی۔ یہ واقعہ آل انڈیا جن سنگھ کے بانی صدر ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کی وفات سے چند روز پہلے کا ہے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد مسٹر شیخ عبداللہ کی وزارت اعظمیٰ سے معزولی اور گرفتاری ظہور میں آئی۔ شیخ صاحب کی برطرفی غیر جمہوری طریقہ سے عمل میں لائی گئی اور کشمیر میں غیر جمہوری روایات کی بنیاد پڑ گئی۔

کمیونسٹ اقتدار کا سایہ

کمیونسٹ حضرات ایک مدت سے کشمیر کو اپنی سرگرمیوں کی آماجگاہ بنانے کی ناکام کوششیں کرتے رہے ہیں۔ کشمیر کو خاص طور سے اس لئے کہ اس کی سرحدیں پاکستان کی سرحدوں سے ملنے کے علاوہ چین اور افغانستان کے ساتھ بھی ملتی ہیں۔ اور صرف ایک معمولی قطعہ زمین روس سے اس کی سرحدیں ملنے میں حائل ہے۔ فوجی نقطہ نظر سے کشمیر کو بین الاقوامی اہمیت حاصل ہے۔ کمیونسٹوں نے ۱۹۴۲ء سے اپنے پاؤں کشمیر میں جمانے شروع کئے ہیں۔ جب کہ یو۔پی کے کچھ کمیونسٹ رہنما یہاں آئے اور یہاں کے کچھ نوعمر سیاسی نو آموزوں کو اپنے جال میں پھنسا لیا۔ تب سے گاہے گاہے ملک کے کچھ کمیونسٹ رہنما یہاں آتے رہے۔ انہوں نے نیشنل کانفرنس کے کچھ سرکردہ رہنماؤں سے بھی تال میل پیدا کیا اور انہیں اپنا ہمنوا بنایا۔ اس طرح سے یہاں کمیونسٹ پارٹی کی داغ بیل پڑ گئی۔ لیکن فرق یہ تھا کہ یہ جماعت علیحدہ طور ایک باضابطہ پارٹی کی طرح کام کرنے نہیں لگ گئی بلکہ اس جماعت کے افراد نیشنل کانفرنس کا سہارا لے کر اسی کے دامن میں سیاسی پرورش پانے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کمیونسٹ رہنماؤں نے نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کے ساتھ اس قدر گہرا رابطہ پیدا کیا کہ وہ نیشنل کانفرنس کی سیاست پر اثر انداز ہونے لگے۔ ۱۹۴۴ء میں کچھ کمیونسٹ رہنماؤں نے ریاست جموں و کشمیر کیلئے کمیونزم کی اساس پر ایک سیاسی پروگرام و اقتصادی منصوبہ "نیا کشمیر" نیشنل کانفرنس کو مرتب کر کے دے دیا۔ جس کی تشہیر نیشنل کانفرنس نے اپنا پروگرام تصور کر کے ریاست بھر میں کی۔ اس طرح سے انہوں نے ریاست کی سیاست کو اپنے سانچوں میں ڈھالنا شروع کر دیا۔

رفتہ رفتہ کمیونسٹوں نے ریاست میں نیشنل کانفرنس کا ہمدرد بن کر اپنی سرگرمیاں تیز تر کر دیں۔ اور ریاست میں راجواڑہ شاہی ختم کر دینے کا اقدام کرنے پر مسٹر شیخ محمد عبداللہ کو اکسایا۔ چنانچہ ان ہی کی ترغیب پر ۱۹۴۶ء میں شیخ صاحب نے "کشمیر چھوڑ دو" کا نعرہ بلند کیا۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے کہ کمیونسٹ پارٹی عام طور پر اپنی علیحدہ حیثیت میں نمایاں طور پر ریاستی عوام کے سامنے نمودار نہیں ہوئی۔

۱۹۴۷ء میں ریاست جموں وکشمیر پر پاکستانی حملہ کے دوران جب عنان حکومت مسٹر شیخ عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کے ہاتھوں میں منتقل ہوئی۔ تو کمیونسٹ حضرات ہر شعبے پر ابر محیط کی طرح چھانے لگے۔ یہاں تک کہ انہوں نے مقامی کمیونسٹ کارکنوں کے ساتھ مل کر ریاست کی علیحدہ فوج کو منظم کرنا شروع کیا۔ جو یہاں کی "نیشنل ملیشیا" کے قیام کی طرف ابتدائی قدم تھا۔ کامریڈ راج بنس کرشن اس کام میں پیش پیش رہے۔ کامریڈ بی۔ پی۔ ایل۔ بیدی نے انفارمیشن اور پروپیگنڈا کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ان کی اہلیہ نے محکمہ تعلیم میں ہاتھ ڈال لیا۔ کلچرل فرنٹ کو منظم کرنے میں شری شیو دان سنگھ چوہان رہنمائی کرنے لگے۔ مختصر یہ کہ خواجہ غلام محمد صادق اور کامریڈ دھنونتری کی سرپرستی میں کمیونسٹوں کی سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں۔ اور وہ شیخ صاحب کی تعریف نہ توصیف کر کے آگے بڑھنے کی کوششوں میں مصروف رہے۔ تاکہ اپنے اصلی مقصد یعنی مکمل اقتدار حاصل کر کے کشمیر کو روس اور چین کے سایہ تلے ایک آزاد کمیونسٹ مملکت بنائے جانے میں کامیابی حاصل کریں۔ اس طرح سے وہ ہندوستان کی سیاست پر اثر انداز ہو جانا چاہتے تھے۔ آج کل چین اور پاکستان کے بہت اچھے اور گہرے تعلقات ہونے کی وجہ سے ان کی ہمدردیاں خصوصی طور پر پاکستان کے ساتھ ہیں۔ بہرحال اس مرحلہ پر مسٹر شیخ عبداللہ بھی اپنے عزائم میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے حسب سابق کمیونسٹوں کی امداد کو شامل حال رکھنا چاہتے تھے۔ حالانکہ سوشلسٹوں نے ہمیشہ شیخ صاحب اور نیشنل کانفرنس کو پُرخلوص امداد اور تعاون دے رکھا ہے۔ کمیونسٹ سیاسی اعتقادات پر کم اور سیاسی مصلحت پر زیادہ بھروسہ رکھتے ہیں۔ شیخ صاحب بھی کمیونسٹوں کے مشورہ پر وقتی مصلحت کو فوقیت دیتے تھے۔

"جموں نیشنل کانفرنس کے غیر کمیونسٹ گروپ نے ثابت قدمی سے دھنونتری کی کارگزاریوں کا مقابلہ کیا۔ جس کی امداد پہ ریاست کی ساری طاقت تھی۔ تنظیم پر تسلط ادم پر کاش صراف اور اس کے ساتھیوں کو جماعت سے علیحدہ کرنے کی صورت میں ہی حاصل ہو سکتا۔ جن کے خلاف یہ الزام تھا کہ انہوں نے مہاراجہ کے خلاف مہم چلا کر ریاست میں شاہی ادارہ کے خاتمہ کے نتیجہ میں یوم نجات منظم کیا تھا۔ عبداللہ کو یہ اطلاع دی گئی کہ مہاراجہ کے خلاف کوئی بھی پروپیگنڈا جموں میں خطرناک صورت حال پیدا کرے گا۔ چونکہ ان کو (شیخ عبداللہ کو) غیر کمیونسٹ گروپ کے ساتھ نہ

ہی زیادہ تعلقات تھے اور نہ ہی اس کے تئیں احترام، انہوں نے اس مشورہ کو قبول کر کے جموں میں تنظیم کو دھنونتری کے نامزدگان کے حوالہ کر دیا جنہوں نے مہاراجہ کے کئی حامیوں کو جیت لیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کام میں ان کے (دھنونتری کے) بھائی اور مہاراجہ کے پرسنل اسسٹنٹ بھیم سین ماہی بہت مددگار ثابت ہوئے۔" ۱؎

غرض کہ کمیونسٹوں کو پوری سرکاری حمایت اور سرپرستی حاصل تھی اور انہیں تمام قسم کی سہولیات بہم پہنچائی جاتی تھیں۔

"جموں میں کمیونسٹوں نے مئی ۱۹۵۳ء میں اپنی انفرادی طاقت کا مظاہرہ ڈیموکریٹک یوتھ لیگ کی کانفرنس کے ذریعہ کیا۔ جس کی صدارت صادق (صاحب) نے کی۔ اور جس کو ہیرن مکرجی اور دوسرے کمیونسٹ لیڈروں نے خطاب کیا۔ اگرچہ یہ بلاروک کمیونسٹ مظاہرہ تھا لیکن اس کو تمام سرکاری امداد حاصل ہوئی۔ بخشی (صاحب) کے ماتحت گورنمنٹ ٹرانسپورٹ مفت فراہم کیا گیا۔ آپ نے اور عبداللہ (صاحب) نے کانفرنس کی کامیابی کے لئے ملاقاتی امداد دے دی" .... ہندوستان ٹائمز مورخہ ۲۳ مئی ۱۹۵۳ء نے یہ صورت گری کی ہے۔ "نیشنل کانفرنس کمیونسٹوں کے حق میں دستبردار ہو گئی ہے چونکہ کو کہ سرکاری سرپرستی حاصل ہے لیکن ... بے اطمینانی پھیلی ہوئی ہے" ۲؎

کمیونسٹ اور سرکار کسی بھی غیر کمیونسٹ سرگرمی کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ اور غیر کمیونسٹوں کو تہمتیں دیا کرتے تھے۔ ان کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی۔ کسی بھی غیر کمیونسٹ کو فرقہ پرست کہا جاتا ہے کہ مغربی امپیریلزم کا ایجنٹ ہونے کی تہمت دے کر اس کی مذمت کی جاتی۔ ... ہیں اگرچہ غیر کمیونسٹ حلقے کبھی کوئی عرضداشت، کرنے اور سرینگر یا دہلی میں برسراقتدار حکام کو اس بات کی صداقت کا اطمینان دلاتے۔ یہ وہ خاص وجوہات تھیں۔ جن کی بناء پر بہت لوگوں کی ہمدردیاں کمیونسٹوں کے زیر اثر نیشنل کانفرنس کے ساتھ ختم ہو گئیں" ۱؎

۱؎ "کشمیر افیئرس" (ہندی) نئی دہلی، اگست ۱۹۶۰ء صفحہ نمبر ۴ ... افیئرس دہلی ... اگست ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۷

۲؎ ۔ یوتھ پرکاشن غازی آباد کا انگریزی کتابچہ "کشمیر ... تحریک کا مطالعہ" ۲؎

"کشمیر میں کمیونسٹ تحریک کا مطالعہ" کتابچہ کے صفحہ ۱۰ پہ کمیونسٹوں کے طرز عمل کے بارے میں مندرجہ ذیل واقعہ کا حوالہ دیا گیا ہے:۔

"شاہمیری (صاحب) کو اسمبلی کا مستقل آئینی مشیر مقرر کرنے پہ اسمبلی کے ۱۹۵۲ء والے مارچ سیشن میں فرقہ وارانہ کمیونسٹ گروپ کے ساتھ مسٹر مسعودی کو براہ راست تکرار ہوئی۔ اس گروپ نے (مسٹر) شیخ عبداللہ کو اپنی حمایت میں تیار کیا تھا۔ اور آپ نے کھلے اجلاس میں مسعودی (صاحب) کے خلاف شدید غصہ کا اظہار کیا۔ تب مسعودی (صاحب) سے اسمبلی میں چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے کوششیں ہونے لگیں۔ اور پھر فرقہ پرستوں اور کمیونسٹوں نے (مسٹر) شیخ عبداللہ پر اثر انداز ہوکر مسعودی (صاحب) کو باہر ہندوستان کی پارلیمنٹ میں نکال دینے میں وہ کامیاب ہوگئے۔"

اسی کتابچہ کے صفحہ نمبر ۱۱ پہ مزید درج ہے:۔

"نیشنل کانفرنس کے اندر کمیونسٹوں کی پالیسی وہی معمول کی حکمت عملی کہ سیاسی اور آئینی شائستگی کا لحاظ کئے بغیر صفوں میں گھس کر (تنظیم کو) تصرف میں لاکر (مخالفوں کا) صفایا کیا جائے۔ نیشنل کانفرنس کے مقبول جنرل سیکریٹری (مسعودی صاحب) کو نوٹس دئے بغیر بہت ہی شرمناک حالات میں اپنے عہدے سے برطرف کیا گیا۔ اس کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ ریاست میں اور ورکنگ کمیٹی اور جنرل کونسل کے اندر نہایت ہی نمایاں اور باشعور غیر کمیونسٹ رہنماؤں میں سے تھے" [۵]

شیخ صاحب کے تحت الشعور میں کشمیر کو آزاد رکھنے کا عزم عرصہ سے پرورش پا رہا تھا لیکن کچھ کمزوریوں اور خامیوں کے باعث وہ اس کا اظہار کرنا نہیں چاہتے تھے۔ عزائم تو دونوں کے ایک ہی جیسے تھے۔ لیکن فرق تھا تو یہ کہ کمیونسٹ کشمیر کو روس اور چین کی نگرانی میں آزاد رکھنا چاہتے تھے۔ جبکہ شیخ صاحب اصل میں کشمیر کو برطانیہ اور امریکہ کے سایہ حفاظت میں آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ بہرحال جب دونوں گروہوں کو معلوم ہوا کہ دونوں ایک ہی مطلب کیلئے دو مختلف راستے اپنائے ہیں تو دونوں نے ایک دوسرے سے منہ موڑ کر ناطہ توڑ دیا۔

۹ اگست ۱۹۵۳ء کو جب مسٹر شیخ عبداللہ کو وزارت عظمیٰ سے برطرف کر کے گرفتار کیا گیا اور بخشی صاحب ریاست کے وزیر اعظم بن گئے۔ تو اس وقت

۵۔ کشمیر میں کمیونسٹ تحریک کا مطالعہ صفحہ ۱۱

کمیونسٹ حضرات مسٹر بخشی غلام محمد کے ساتھ مل گئے۔ اور زیادہ سے زیادہ حکومتی اقتدار حاصل کرنے کی دوڑ دھوپ کرنے لگ گئے۔ جو نئی وزارت بن گئی، اس میں اکثر و بیشتر ممبر کمیونسٹ یا کمیونسٹ نواز تھے۔ خواجہ غلام محمد صادق ان ایام میں آئین ساز اسمبلی کے پریذیڈنٹ تھے۔ لیکن اس عہدہ کو اپنے پاس رکھنے کے باوجود وہ مسند وزارت پر بھی جلوہ افروز ہوئے۔ بخشی صاحب نے اس وقت کے مقامی کمیونسٹ اخبار ہفتہ وار "کشمیر" کو مالی امداد دیدی اور شیخ صاحب کی نکتہ چینی کرنے کیلئے ہر ممکن امداد دینے کی پیشکش کی۔

یوں تو محکمہ نشر و اشاعت پر کمیونسٹوں کا عام طور پر ہمیشہ اثر و رسوخ تھا۔ اور ان کی مرضی کے ساتھ اخبارات کو ابھارا یا دبایا جاتا تھا۔

"محکمہ انفارمیشن اور براڈ کاسٹنگ بھی ریاستی اخبارات کو کنٹرول میں رکھ کر ان کو ہدایات دیتا ہے۔ اخبارات کو شائع کرنے کی اجازت بھی یہی محکمہ دیتا ہے۔ اس کے اختیار میں کسی اخبار کو دبانا یا ضمانت لینا بھی ہے۔ سولہ ہفتہ وار اخبارات نیا سماج۔ خالد۔ وکیل اپنا سنسار۔ جمہور اور الحق کو کلیتاً دبا دیا گیا ہے۔ .... کچھ ہندوستانی اخبارات کو بخشی حکومت کے حق میں لکھنے کیلئے روپے بھی دیئے گئے ہیں" [۱]

نئی وزارت کے قیام کے بعد ملک بھر کے کئی کمیونسٹ لیڈر کشمیر میں طرح اقامت ڈال گئے۔ چنانچہ ڈاکٹر کے۔ ایم۔ اشرف بھی اپنی سرگرمیوں کا مرکز کشمیر کو بنانے کیلئے یہاں آئے۔ حالانکہ وہ پاکستان بننے کے بعد کچھ مدت تک لندن میں قیام پذیر تھے۔ بعد میں انہیں ہندوستان واپس آنے کی اجازت مل گئی تھی۔ چونکہ محکمہ تعلیم کا قلمدان صادق صاحب کے پاس تھا۔ اس لئے اشرف صاحب کو محکمہ تعلیم کے مشیر کے عہدہ سے نوازا گیا۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر زیڈ۔ اے۔ احمد شری راما مورتی، شری سردار جعفری، وغیرہ کمیونسٹ رہنما یہاں آتے رہے اور مقامی کمیونسٹوں کے ساتھ ساز و باز کرتے رہے۔ یہ بات تو واضح ہے کہ یہاں ہمیشہ ... بالکل تھوڑے ہی کمیونسٹ ہیں۔ اور یہاں کبھی کمیونسٹ

---

[۱] کشمیر میں کمیونسٹوں کی سازش پی۔ این۔ لکھن پال صفحہ ۴۲۔۴۳

تحریک عوامی تحریک بن نہ سکی۔ البتہ جہاں کمیونسٹوں نے نیشنل کانفرنس پر چھا جانے کی کوشش کی۔ وہاں انہوں نے حکومت میں بھی گھسنے کی سعی کی۔ نیشنل کانفرنس کے فعال جماعت اور برسراقتدار ہونے کی وجہ سے کمیونسٹ ہمیشہ اس کے اندر ہی رہ کر اس پر قبضہ جمانے کی تاک میں رہے۔ کمیونسٹوں کو بجائے خود عوام کی کبھی حمایت حاصل نہیں تھی لیکن انہیں حکومت میں اچھا خاصا حصہ ملتا رہا۔

محکمہ تعلیم میں خصوصی طور پر کمیونسٹ نواز بن جانا ترقی کے زینے کی طرف قدم بڑھانے کے مترادف تھا۔ محکمہ مذکورہ میں جو کمیونسٹ یا کمیونسٹ نواز تھے انہیں ترقیوں سے نوازا جاتا رہا اور محکمہ میں ان کی ہیش چلتی رہی۔

"تعلیمی قابلیت اور نوکری میں سینیارٹی کا لحاظ رکھے بغیر کئی تبدیلیاں (محکمہ تعلیم میں) اور نئی بھرتیاں عمل میں لائی گئیں ...... مسٹر صادق کی دوسری ...... کو ویمنز کالج سرینگر کا پرنسپل متعین کرنا اس کی ایک مثال ہے۔ کالج میں وہ نہ صرف ایک جونیئر لیکچرر ہے۔ بلکہ وہ سخت پاکستان نواز کمیونسٹ بھی ہے۔ وہ کبھی اپنے : اس نظریہ کو نہیں چھپاتی ہے کہ کشمیر پاکستان کو مل جانا چاہئے۔ کیونکہ پاکستان کو ریاست پر جائز حق ہے۔" [1]

اسی پالیسی کو زیر نظر رکھ کر محکمہ تعلیم کو نئی لائنوں پر منظم کرنے کی کوششیں کی گئیں محکمہ کے ملازموں کو عموماً اور نوجوانوں کو خصوصاً کمیونسٹ "ترقی پسندی" کے سانچے میں ڈھالنے کیلئے محکمہ ہذا کی طرف سے جابجا "نوجوان کلب" قائم کئے گئے۔ بہرحال مسٹر بخشی غلام محمد کی کارکردگیوں کے مقابلے میں یہ کوشش ایک صحت مند نشانی تھی۔ اس لئے کہ نوجوانوں کے ذہن میں آہستہ آہستہ تبدیلی آکر وہ تنگ نظری اور رجعت پسندی کے نظریوں کی غلامی سے آزاد ہو جاتے۔ جو بالآخر ایک صحت مند ذہنی ابھار کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا۔ محکمہ کے جن ملازمین کا کمیونسٹوں یا کمیونزم کے ساتھ کبھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بھی اب نئی روش دیکھ کر اپنی نوکری کے استحکام، ترقی کے ذرائع نکالنے اور دیگر سہولیات حاصل کرنے کیلئے کمیونسٹ نواز بن گئے تھے۔

---

[1] کشمیر میں کمیونسٹوں کی سازش مصنف پی۔ ایل۔ لکھن پال صفحہ ۳۲

اور کچھ نوجوان نوکری تلاش کرنے کی غرض سے کمیونسٹوں کے زمرے میں آنے لگے تھے کمیونسٹ لٹریچر فروخت کرنے والے کمیونسٹوں کو مالی امداد پہنچانے اور طالب علموں کا رجحان کمیونسٹوں کی طرف راغب کرانے کیلئے بھاری مقدار میں کمیونسٹ لٹریچر سرکاری روپیہ سے خریدا گیا اور سکولوں اور کالجوں کی لائبریریوں میں بھیجا گیا۔ اس ضمن میں ایک مقامی اخبار میں چھپے ہوئے ایک مراسلہ کے اقتباسات درج ذیل کیے جاتے ہیں۔

"سنا گیا ہے کہ سابقہ انسپکٹر آف سکولز کے دور انسپکٹری میں وادی بھر کے ہائی سکولوں میں کمیونسٹ لٹریچر پر کتابیں خرید کر لی گئیں۔ اور یہی کتابیں ہائی سکولوں کی لائبریریوں کی زینت بخش رہی ہیں ...... "کہا جاتا ہے کہ سابقہ انسپکٹر سکولز نے ہائی سکولوں کے ہیڈ ماسٹروں سے پوچھے بغیر اور ان سے مشورہ کیے بغیر یہ لٹریچر آپ ہی خرید کر کے ہائی سکولوں میں بھجوا دیا۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے۔ ہم پوچھ سکتے ہیں۔ کہ ہائی سکولوں میں کمیونسٹ لٹریچر کی ضرورت ہی کیوں محسوس کی گئی؟ ....

"اگر پچھلے دنوں جناب بخشی صاحب اور جناب میر قاسم صاحب یہ اعلان کر چکے ہیں کہ کشمیر میں کمیونسٹوں کی پیش نہیں چلتی۔ کمیونسٹ یا کمیونسٹ نواز اشخاص کو حکومت میں اثر و رسوخ نہیں تو ہم بصد التماس پوچھ سکتے ہیں کہ تعلیمی اداروں میں کمیونسٹ لٹریچر کا موجود ہونا کیا معنی رکھتا ہے"[۱]

تعجب اس امر کا ہے کہ حکومت اور نیشنل کانفرنس میں واضح طور کمیونسٹوں کی سرگرمیاں جاری رہنے کے بعد ممبران کابینہ اور نیشنل کانفرنس کے رہنما جن میں خود بخشی صاحب بھی شامل تھے، یہ اعلان کرتے نہیں تھکتے۔ کہ حکومت اور نیشنل کانفرنس میں کوئی کمیونسٹ نہیں ہے۔ اور کہ ایسے شوشے محض دشمنوں کی طرف سے کھڑا کیے جاتے ہیں تاکہ وہ تفرقہ ڈال سکیں۔

دراصل بات یہ ہے کہ نیشنل کانفرنس کا کمیونسٹ گروہ اور بخشی دھڑہ

---

[۱] منقول از "کشمیر اور کمیونسٹ" صفحہ ۷۴ پروفیسر بلراج چاڑھا

زور زبردستی حکومتی کرسیوں پہ براجمان رہے تھے۔ ان کی بدعنوانیوں اور بے ضابطگیوں کی وجہ سے ریاستی عوام کو یہ بات اچھی طرح سے ذہن نشین ہوئی کہ انہیں عوام کی بھلائی اور خوشحالی کی کوئی فکر دامنگیر نہیں ہے۔ انہیں اگر غرض ہے تو اپنے حلوے مانڈے سے۔ اقتدار کے متوالے دونوں گروہوں کو اپنی اس کمزوری کا احساس تھا جب ہی تو انہوں نے ایک دوسرے کی خامیوں اور کمزوریوں کی چشم پوشی کی۔ نتیجہ کے طور پر وہ اپنے باہمی مفاد کی خاطر ایک دوسرے کو جھوٹا سہارا دیتے رہے۔ ورنہ یہ حیران کن بات ہے کہ ریاست میں ۱۹۵۷ء کی وزارت بننے تک یہ دونوں گروہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے رہے کہ ہم میں کوئی کمیونسٹ نہیں اور کہ ہماری ایکتا ہمارے دشمنوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتی ہے۔ اسی لئے تفرقہ ڈالنے کیلئے کمیونسٹ اور غیر کمیونسٹ کے سوال کو ہوا دی جا رہی ہے۔

لیکن جب ۱۹۵۷ء میں نئی وزارت کا قیام مسٹر بخشی غلام محمد کی قیادت میں پھر زیر عمل آیا۔ اور کمیونسٹ نواز عنصر نے نیشنل کانفرنس سے علیحدہ ہو کر ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کو تشکیل دی تو مسٹر بخشی غلام محمد نے فوراً ایک پریس کانفرنس میں اپنے بچھڑے ہوئے ساتھیوں پر دوش دے دیا کہ یہ لوگ کمیونسٹ ہیں اور ان سے کمیونسٹوں جیسا ہی سلوک کیا جائے گا۔ انہوں نے اپنے سابقہ بیانات کی دیکھتے دیکھتے ہی مٹی پلید کی۔ کہ ان میں کوئی کمیونسٹ نہیں ہے۔ صادق گروپ کی علیحدگی کے بعد نیشنل کانفرنس کی نئی ورکنگ کمیٹی نے ایک قرارداد کے ذریعے اس بات پر اظہار اطمینان کیا کہ نیشنل کانفرنس سے وہ لوگ نکل گئے جو نظریاتی الجھن پیدا کیا کرتے تھے " یہ لوگ راتوں رات کمیونسٹ کیسے بن گئے تھے، جب کہ حکمران خود اس دم تک اس بات سے برابر انکار کرتے رہے۔ اگرچہ اس بات میں شک نہیں کہ یہاں کے کمیونسٹ عام طور موقع پرست فرقہ پرست اور برائے نام کمیونسٹ ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس وقت تک مسٹر بخشی غلام محمد اپنے اقتدار کو مستحکم بنانے کیلئے ملک بھر کے کمیونسٹوں سے امداد حاصل کرتے رہے۔ لیکن ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کی تشکیل کے بعد کمیونسٹ بخشی صاحب کے خلاف پروپگنڈا شروع کرنے میں لگ گئے۔

"ہندوستان کے اندر بھی بخشی (صاحب) کے خلاف منظم پروپیگنڈا کی شہادت ملتی ہے۔ ایک دن راقم نے بخشی (صاحب) کی مخالفت

میں سوویت نیوز پرنٹ پر چھپا ہوا ایک پمفلٹ دیکھا۔ اس پمفلٹ
میں اس کو کشمیر میں غدارانہ سرگرمیاں کرنے کا الزام دیا گیا تھا"[1]
یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بخشی گروپ بھی دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک
کر حکومت اور نیشنل کانفرنس میں کمیونسٹ عنصر کی موجودگی کے بارے میں خلاف واقعات
اور تردیدی بیانات کیوں دیتا رہا، جبکہ اس گروپ کو بخوبی معلوم تھا کہ حکومت اور
تنظیم میں کمیونسٹ اچھی تعداد میں موجود ہیں۔ اگر تردیدیں ایماندارانہ تھیں اور تنظیم
کے اندر کوئی کمیونسٹ موجود نہیں تھا تو پھر کیا بعد میں اپنے ساتھیوں کی نکتہ چینی
سے گھبرا کر اپنے اقتدار کے تحفظ کیلئے بخشی صاحب کو اور کوئی حربہ نظر نہیں آیا جو
اپنے بچھڑے ہوئے ساتھیوں کو کمیونسٹ نام دے کر ان کی مخالفت پر کمربستہ ہوئے
حالانکہ اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ سنہ ۱۹۵۳ء کے وزارتی تغیر کے بعد حکومت
اور حکمران جماعت میں کمیونسٹ عنصر کا خاصا حصہ رہا ہے لیکن یہ امر تعجب انگیز ہے
کہ ریاست کا وزیراعظم وقت اور برسر اقتدار جماعت کا صدر کمیونسٹ عنصر کی
موجودگی سے اپنے آپ کو اتنا غیر واقف اور لاتعلق ظاہر کرے کہ کمیونسٹوں کی
موجودگی سے کلیتاً منکر ہو جائے لیکن جب علیحدہ ہو کر اس عنصر نے حکومت کی
بدعنوانیوں کی بناء پر بخشی صاحب کو چیلنج کیا تو گھبرا کر اپنے اقتدار کی بقا کی خاطر بخشی
گروپ کی نیند کھل گئی اور لگے کہنے کہ یہ لوگ کمیونسٹ ہیں۔ ظاہر ہے کہ بخشی صاحب
کو معلوم تھا کہ یہ گروہ کمیونسٹ رجحان کا حامل ہے۔ لیکن اپنے باہمی اقتدار کو مستحکم
بنانے اور مشترکہ مفاد کی خاطر یہ دونوں دھڑے عوام کو روندتے گئے۔ کمیونسٹ عنصر
کے اخراج پر بخشی گروپ کے ایک حمایتی اخبار نے اپنے ایک خاص ضمیمہ میں دبے الفاظ
میں اشارہ کرکے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ باہمی مفاد کی خاطر کمیونسٹ گروہ کی ہر جائز
و ناجائز بات کی حمایت کی جاتی رہی۔ اخبار میں درج تھا۔

"ہم نے اب تک اس گروپ (کمیونسٹ گروپ) کی اس لئے حمایت کی
کہ یہ نیشنل کانفرنس کا جامہ پہنے ہوئے تھا۔ ہم تنظیم کو درہم برہم کرنے
کے خلاف تھے۔ ان کی ہر جائز اور ناجائز بات کی حمایت کرتے رہے"[2]

---

[1] "کشمیر میں کمیونسٹوں کی سازش" جولائی ۱۹۵۴ء پی۔ ایل۔ لکھن پال، صفحہ ۷
[2] - اخبار "دیش" مورخہ ۱۳ اگست ۱۹۵۴ء

مسٹر بخشی غلام محمد نے ۱۹۵۳ء کی نئی وزارت کے بارے میں اعلان کیا تھا کہ وہ ان کی وزارت میں سب نیشنل کانفرنسی ہیں۔ کمیونسٹ ایک بھی نہیں۔ کم از کم کوئی ایسا کمیونسٹ وزارت میں موجود نہیں جس کے کمیونسٹ ہونے کے بارے میں انہیں علم ہو ۔ سلہ ۱

بخشی صاحب نے بار بار اپنے ساتھیوں کو کمیونسٹ ہونے کے الزام سے سبکدوش کرنے کی کوشش کی بلکہ نئی وزارت کے قیام کے بعد عملاً وہ کمیونسٹوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے :۔

"وزیر اعظم کشمیر اور ہندوستان و ریاست کے سرکاری ترجمانوں نے بار بار اس حقیقت سے انکار کیا کہ کشمیر سرکار پر کمیونسٹ چھائے ہوئے ہیں اور بخشی (صاحب) ان کے ہاتھوں میں عملی طور ایک کھلونا ہے۔ اور اپنے ساتھیوں کو کمیونسٹ ہونے کے وصبہ سے مبرا کرنے کی کوشش میں اس حد تک جاتے ہیں کہ کشمیر کابینہ اور نیشنل کانفرنس میں ایک بھی کمیونسٹ نہیں ہے "۔ سلہ ۲

اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ نیشنل کانفرنس کی طرف سے اس بارے میں پمفلٹ اور کتابچے شایع ہوتے رہے کہ حکومت اور نیشنل کانفرنس میں کوئی کمیونسٹ نہیں ہے اور اس قسم کی باتیں پھیلانے والے کشمیر اور باقی ہندوستان کے دشمن ہیں۔ نیشنل کانفرنس کے بڑے بڑے لیڈروں نے اس الزام کے خلاف بڑے بڑے بیانات دیئے اور سوشلسٹوں و دیگر غیر کمیونسٹوں کو ہدف ملامت ٹھہرایا۔ نیشنل کانفرنس کی طرف سے اس ضمن میں کسی فرضی سبھا سوسائٹی کے نام پر کچھ کتابچے بھی شایع کرائے گئے۔ ایک ایسے ہی کتابچہ میں نیشنل کانفرنس کے ایک سرکردہ بزرگ رہنما اور اس وقت کے راجیہ سبھا کے ممبر سردار بدھ سنگھ نے اس الزام تراشی پر سوشلسٹوں کو سامراجی ایجنٹ قرار دے دیا تھا۔

"ان کی (سوشلسٹوں کی) ایسی سرگرمیوں سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ وہ درحقیقت سامراجی طاقتوں کے ایجنٹوں کا کام کر رہے ہیں

سلہ ۱ "کشمیر اور کمیونسٹ" صفحہ ۱ پروفیسر چڈھا۔ سلہ ۲ "کشمیر میں کمیونسٹوں کی سازش" جولائی ۱۹۵۴ء پی۔ ایل۔ لکھن پال صفحہ ۱۲

جن کی تہہ میں ہندوستان اور کشمیر کے عوام میں غلط فہمی پھیلانے
... کشمیر کے متعلق ہو رہی سامراجی سازشوں
پر پردہ ڈالنے کا جذبہ کار فرما ہے"۔ ؎۱

سردار بدھ سنگھ اسی کتابچہ میں آگے چل کر صفحہ نمبر ۴ پر لکھتے ہیں :-
وہ ہندوستان میں ذاتی غرضیں اور مفاد خصوصی رکھنے والے ۔ سامراجی پروپیگنڈا
کرنے والی انجمنوں کے ساتھ ساز باز رکھنے والے ریاست کے باہر کے چند
اشخاص ہیں کہ آئے دن اس مسئلہ کو مختلف رنگوں میں اچھال رہے ہیں۔
جس کا مقصد درحقیقت یہ ہے کہ کشمیر میں ہو رہی سامراجی سازشوں
پر پردہ ڈالا جائے اور ان سازشوں کے خلاف لڑنے والے عناصر کو بدنام
کیا جائے۔ یہ اصحاب بظاہر کشمیر کے دوست، ہندوستان اور کانگریس
گورنمنٹ کے وفادار بنتے ہیں۔ مگر درحقیقت کشمیر اور ہندوستان کی
گورنمنٹوں اور عوام کے تعلقات کو خراب کرنے اور سامراجی سازشوں کو
کامیاب کرنے کا وطن دشمنانہ کھیل کھیل رہے ہیں۔ اور اب آخری حربہ
جو انہوں نے استعمال کیا ہے۔ وہ یہ پروپگنڈا ہے۔ کہ گورنمنٹ جموں
و کشمیر میں اور نیشنل کانفرنس میں کمیونسٹ گھس گئے ہیں"

آگے چل کر سردار صاحب صفحہ ۷ پر اس الزام کو بے جا دخل اندازی کرنے اور بہترین
کارکنوں کے خلاف بد اعتمادی پھیلا کر انتشار پھیلانے کے مترادف سمجھتے ہوئے
مزید لکھتے ہیں :-

"یہ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ جب اور کسی اعتراض کی گنجائش
نہ رہی تو مخالفین کا محض کمیونسٹ کا ہوّا دکھا کر بہترین کارکنوں کے خلاف
بد اعتمادی پیدا کرنا اور کیبنیٹ اور کانفرنس کے اندر پھر سے انتشار،
گڑبڑ پیدا کرنا، بیجا دخل اندازی کرنا، نہایت خطرناک اور نامناسب
کارروائی ہے۔"

اس کے بعد صفحہ ۹ پر سردار صاحب رقمطراز ہیں کہ :-
"بخشی صاحب وغیرہ کے اعلان کرنے کے باوجود بھی کہ تنظیم اور حکومت

؎۱ "کشمیر میں کمیونسٹ ہوّا" صفحہ ۲۳

> کی صفوں میں کمیونسٹ موجود نہیں ہیں۔ یہ الزام دینا محض پروپگنڈا ہے۔ لیکن اس واضح بیان کے باوجود انتہائی ڈھٹائی اور عجیب چالاکی سے کمیونسٹ کمیونسٹ کہہ کر مخالف پروپگنڈا جاری رکھ رہے ہیں۔ اور مخالفت میں اس قدر اندھے ہو رہے ہیں کہ نیشنل کانفرنس کے کارکنان کی ایماندارانہ ملکی و قومی خدمات اور طرز عمل کو نظر انداز کر کے مخالفت بغرض مخالفت کر رہے ہیں "

جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے۔ کہ کمیونسٹوں کا ریاست میں کہیں کبھی براہ راست عوام میں اثر و رسوخ نہیں رہا ہے۔ اور نہ انہیں کسی بھی جگہ عوام کی پشت پناہی حاصل رہی ہے۔ بلکہ یہ برسر اقتدار جماعت کا سہارا لے کر اپنی سیاسی زیست کو موقع اور محل کے مطابق قائم رکھے ہوتے ہیں۔ اور اپنی کوئی بنیاد نہ ہوتے ہوئے بھی اقتدار میں شریک رہے۔ سوشلسٹ بھی جب شور اٹھاتے کہ کشمیر میں کمیونسٹ اقتدار بڑھ رہا ہے تو ان چیتاونیوں کو دشمنی پر محمول کیا جاتا تھا۔ جب ۱۹۵۴ء میں ریاست جموں و کشمیر میں آل انڈیا پرجا سوشلسٹ پارٹی کی شاخ قائم کی گئی۔ تو اس وقت کے پارٹی چیرمین سورگیہ شری آچاریہ نریندر دیو نے ریاست میں پرجا سوشلسٹ پارٹی کی شاخ قائم کرنے کے لئے ایک وجہ یہ بھی دی تھی کہ کشمیر میں کمیونسٹوں کا اقتدار بڑھ رہا ہے اور اس کے خطرناک نتائج کی پیشبندی کرنے کی غرض سے پارٹی کی شاخ ریاست میں قائم کی جا رہی ہے لیکن ریاستی حکمران ایسی باتیں کہنے والوں کو دشمن تصور کرتے رہے

> روزنامہ ٹربیون کے نامہ نگار کے مطابق جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کے سرکاری ترجمان روزانہ "خدمت" سرینگر نے حال ہی میں پانچ مضامین لکھے ہیں۔ جن میں سوشلسٹ لیڈر ڈاکٹر رام منوہر لوہیا، منشی احمد الدین اور تلک راج چڈھا کا نام لے کر ان پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ یہ لوگ کشمیر کو ایک دوسرا کوریا بنانے کی سازش میں ہیں۔ "خدمت" کے خیال میں جب یہ لوگ ہند اور کشمیر کے عوام کو یہ چیتاونی دیتے ہیں کہ وہ کشمیر کو ایک تحفہ کے طور پر پیش نہ ہونے دیں تو وہ کشمیری عوام سے دشمنی کرتے ہیں۔ اور جمہوریت اور سیکولرازم کے خلاف کارروائیوں میں شامل ہوتے ہیں۔ اسی دوران کشمیر نیشنل کانفرنس کے کچھ حلقوں

کی طرف سے بھی اس بات کی بار بار تردید ہو رہی ہے کہ ریاست کے کچھ وزیر اور ڈپٹی وزیر کمیونسٹ ہیں۔ ان حلقوں کا بیان ہے کہ جو لوگ کشمیر میں کمیونسٹوں کا ہوّا دکھا رہے ہیں وہ دانستہ طور پر کشمیر کے متعلق غلط فہمی پیدا کر رہے ہیں اور یہ کہ اگر گذشتہ اگست کے سنکٹ سے پہلے یہ وزیر کمیونسٹ نہیں تھے۔ تو اب بھی انہیں کمیونسٹ نہیں کہا جا سکتا" ؎۱

نیشنل کانفرنس کی میٹنگوں میں بھی کمیونسٹ اور غیر کمیونسٹ کے سوال کو ختم کرنے کی قرار داد منظور کر کے کمیونسٹوں کی پیٹھ ٹھونکی گئی تھی اور جو لوگ ان کمیونسٹوں کے خلاف آواز اٹھاتے تھے۔ انہیں "خطرناک اور موقع پرست عناصر" سے تشبیہہ دی جاتی تھی۔ اس وقت میرے سامنے نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کی ایک منظور شدہ قرار داد ہے۔ جو نیشنل کانفرنس کی دستاویز "ہمارا راستہ" نامی مطبوعہ کتابچہ (ستمبر ۱۹۵۴ء) میں مندرج ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ریاست میں پرجا سوشلسٹ پارٹی کی شاخ قایم کرنے کے اقدام کئے جا رہے تھے۔ ورکنگ کمیٹی کی منظور شدہ اس قرار داد میں ان کمیونسٹوں کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کے بارے میں مندرجہ ذیل الفاظ درج ہیں :-

"ہماری ریاست کے اندر اور باہر کچھ ایسے خطرناک اور موقع پرست عناصر بھی سرگرم ہیں۔ جنہیں ہمارے پروگرام اور ہماری پالیسی سے دشمنی ہے۔ وہ عوام میں غلط رجحانات کو ہوا دیتے ہیں ..... یہ لوگ ہمارے کسی ایک رہنما کی تعریف کرتے ہیں تو دوسرے رہنما پر بہتان تراشتے ہیں اور اپنے طور پر یہ کوشش کرتے ہیں کہ قومی رہنماؤں میں امتیاز پیدا کر کے ان کے اتحاد پر ضرب لگائیں۔ یہی لوگ کمیونسٹ ہوا بھی کھڑا کرتے ہیں۔ .... جب نیشنل کانفرنس نے ۱۹۴۴ء میں اپنا تاریخی پروگرام "نیا کشمیر" منظور کیا تھا تو یہی لوگ تھے۔ جنہوں نے سامراج اور جاگیرداروں کی مدد کرنے کے لئے کمیونزم کا ہوا کھڑا کیا۔ ہم نے "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک

؎۱ "کشمیر اور کمیونسٹ" صفحہ ۴۲، ۴۳، ۴۴ پروفیسر بلک راج چڈھا

شروع کی۔ تو عین اس وقت جب کہ ہماری قوم سامراج اور شخصی حکومت کے خلاف صف آرا ہو رہی تھی۔ انہوں نے کمیونسٹ اور غیر کمیونسٹ کا سوال کھڑا کر کے قومی صف میں انتشار ڈالنے کی کوشش کی ۱۹۴۷ء کے بعد بھی یہ کوششیں جاری رہیں .... ہم اپنی تنظیم میں کارکنوں اور ممبروں سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ قومی پروگرام اور نیشنل کانفرنس کی پالیسی پر عمل کریں اور کمیونسٹ و غیر کمیونسٹ جیسے سوالوں میں الجھنے سے گریز کریں۔ یہ سوال انتشار ڈالنے کیلئے اٹھائے جاتے ہیں۔"

ظاہر ہے کہ یہ دونوں گروپ اپنی اپنی کمزوریوں کو جانتے ہوئے اور اپنے اقتدار کو بحال رکھنے کیلئے ایک دوسرے کی پُرفریب اور مکارانہ امداد کرتے رہے۔ کمیونسٹ نواز عنصر جب نیشنل کانفرنس اور ریاستی حکومت میں برسر اقتدار تھا تو اس وقت انہوں نے بخشی صاحب کے ساتھ مل کر نیشنل کانفرنس کی مجلس عاملہ میں یہ قرارداد منظور کرائی کہ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کو کشمیر کے اندرونی معاملات میں دخل نہیں دینا چاہئے۔ لیکن جب اقتدار چھٹ گیا۔ تو ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کو امداد کیلئے پکارنے لگے۔ اس کے سرکردہ رکن اور سابقہ وزیر مال سید میر قاسم (جو اب ریاست کے چیف منسٹر ہیں) نے ۱۲ دسمبر ۱۹۵۷ء کو دہلی کی ایک پریس کانفرنس میں بیان دیتے ہوئے ہندوستانی عوام سے تعاون دینے کی اپیل کی۔ انہوں نے کہا:۔

"بھارت کی رائے عامہ کو کشمیر کے حالات سے واقف رہنا چاہئے اور وہاں جمہوری ورکروں کا احترام کرانے کیلئے اپنا تعاون پیش کرنا چاہئے"۔ لہ

اس کے علاوہ ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کے اس رہنما نے یہ بھی کہا کہ:۔

"اس وقت موقع ہے کہ بھارت کی مرکزی سرکار کشمیر کی ایڈمنسٹریشن کو سدھارنے میں مداخلت کرے۔ اور بھارت میں رہنے والے عوام وہاں پر ایڈمنسٹریشن کی بدعنوانیوں کو فاش کریں۔ نیز ان کے خلاف آواز اٹھائیں" ۲ھ

لہ اخبار "پرتاپ" نئی دہلی مورخہ ۱۳ دسمبر ۱۹۵۷ء۔ ۲ھ اخبار "تیج" دہلی مورخہ ۱۴ دسمبر ۱۹۵۷ء

عیاں ہے کہ دونوں گروپوں میں مکمل اقتدار کے حصول کیلئے کشمکش رہی ہے۔ اور اقتدار کو کاری ضرب لگنے پر ہی اعتراف حقیقت اور انکشاف اصابت کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔

۱۹۵۷ء میں کمیونسٹ اور کچھ ترقی پسند عناصر نے نیشنل کانفرنس سے علیحدہ ہوکر ڈیموکریٹیک نیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں لایا۔ اس جماعت کو کمیونسٹ پارٹی کا نعم البدل سمجھا گیا۔ لیکن اس جماعت کو نیشنل کانفرنس کے مقابلے میں مختلف الخیال جمہور نواز قوتوں اور عناصر کا تعاون حاصل رہا۔ اس جماعت کے لیڈروں کو چونکہ اقتدار کی چاٹ لگی تھی۔ اس لئے وہ کرسئی اقتدار کی جدائی برداشت نہ کر سکے۔ اور بخشی وزارت کی شد و مد کے ساتھ مخالفت کرنے کے چند ہی سال بعد بخشی صاحب کے حضور میں زانوئے ادب ہوکر ان کی قیادت پر اظہار اعتماد کیا۔ اور نہایت انکساری اور شرمساری کے ساتھ پناہ لینے کیلئے واپس نیشنل کانفرنس کی گود میں چلے گئے اور لیلئ وزارت سے دوبارہ ہمکنار ہوگئے۔ اس طرح سے صادق صاحب اور ان کے ساتھیوں نے ۱۹۶۰ء میں حصول اقتدار کی خاطر جہاں ریاست کی ایک جمہوری تحریک پر کلہاڑی ماردی۔ وہاں ریاستی عوام کا اعتماد جمہوری تنظیموں کی پائیداری اور لیڈروں کے ایمان اور قول و قرار پر ختم ہوگیا۔ باقیماندہ کمیونسٹ کارکن بچی کھچی ڈیموکریٹیک نیشنل کانفرنس کے ساتھ ہی وابستہ رہے۔ جو ایک ... تھا اور خالص کمیونسٹ جماعت بنی۔ اور ملکی پیمانے پر کمیونسٹ جماعت کی تقسیم کے بعد مارکسسٹ کمیونسٹ پارٹی اور پھر نکسلائٹ پارٹی کے ساتھ ملحق ہوگئی۔ پند[رہ] سال پہلے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی شاخ بھی یہاں قائم کی گئی ہے۔ جو ہنوز قائم ہے۔ البتہ خود صادق صاحب اور ان کے ہمنوا کانگریس میں شامل ہوگئے۔ اس طرح سے کمیونسٹ اعتقاد رکھنے والے کئی اصحاب اقتدار کی لالچ میں کانگریس کے ساتھ ہیں۔ ایسے ہی ایک کمیونسٹ لیکن کانگریسی منسٹر کے بارے میں سرینگر کے روزانہ انگریزی اخبار "اکنامک پوسٹ" میں ایک بار یہ دلچسپ خبر چھپی تھی

"جموں و کشمیر زمیندار ایسوسی ایشن کے صدر پیر حسام الدین نے ایک پریس کانفرنس کے دوران انکشاف کیا کہ وزیر مال مسٹر ایم۔ این۔ کول نے پچھلے دنوں زمینداروں کے ایک وفد کو بتایا کہ وہ کمیونسٹ ہیں۔ اس

پر وفد نے وزیر مال سے احتجاج کیا۔ کہ وہ وزارت سے استعفیٰ دیں کیونکہ وزارت کمیونسٹ پارٹی کی نہیں بلکہ کانگریسی کی ہے"[1]

ریاستی کانگریس نے ۱۹۷۲ء کے اسمبلی انتخابات میں حلقہ انتخاب شوپیان کی ایک نشست کمیونسٹ پارٹی کیلئے خالی چھوڑ دی۔ حالانکہ اب نہ کمیونسٹ پارٹی کا کشمیر میں کوئی اثر و رسوخ ہے اور نہ کانگریس نے تنظیمی سطح پر ریاست میں کسی تنظیم کیساتھ انتخابی گٹھ جوڑ کیا۔ ظاہر ہے کہ برسر اقتدار کانگریسی کمیونسٹ اب بھی کمیونسٹوں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس سوشلسٹوں کو یہاں ہمیشہ دبانے اور ختم کرنے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں۔

---

[1] اخبار "اکنامک پوسٹ" سرینگر مورخہ یکم جون ۱۹۷۱ء

سوشلسٹ پارٹی کا قیام

سنہ ۱۹۴۷ء میں عوامی راج کے قیام کے بعد نیشنل کانفرنس اور اس کی حکومت نے ریاست جموں و کشمیر میں کوئی دوسری سیاسی جماعت برداشت نہیں کی۔ اگست سنہ ۱۹۵۳ء میں شیخ وزارت کی برطرفی اور نئی وزارت کے قیام سے جن لوگوں کو یہ امیدیں پیدا ہو گئی تھیں کہ شاید اب ریاستی عوام کو مقابلتاً سہولیات میسر ہو نگیں۔ اور نئے حاکم عوامی بھلائی کی طرف متوجہ ہو کر عوام کو آرام و اطمینان کا سانس لینے کا موقع فراہم کرینگے لیکن انہیں جلد ہی اس بات کا احساس ہوا کہ نئی حکومت بھی کچھ کم آمرانہ نہیں ہے غالباً نئے حاکم بھی پرانی ڈگر پر چل کر یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ ان کے ہاتھوں میں بے پناہ طاقت آگئی ہے۔ اور بے حساب دولت بھی۔ اور حالات کی نزاکت کے پیش نظر ان سے اس طاقت کے استعمال اور اس دولت کے مصرف کا کوئی حساب مانگنے والا نہیں۔ نتیجہ کے طور پہ دور حکومت بھی مطلق العنانیت سے میل کھانے لگا۔ اس کا مقابلہ کرنے کیلئے کسی عوامی تنظیم کی ضرورت تھی۔ مقامی طور سے جو بھی جماعت سامنے آجاتی۔ وہ محدود دائرے میں گِھر کر رہ جاتی۔ اور اپنے طور سے اس آمرانہ حکومت کا مقابلہ کرنے کی سکت اپنے اندر نہ پاکر خود ہی موت کی نیند سو جاتی۔

جموں میں جب پرجا پریشد نے کچھ جائز شکایات لے کر آگے بڑھنے کی کوشش کی تو حکومت نے سختی سے اس کو دبانے اور کچلنے کی سعی کی۔ پرجا پریشد کی سیاست بے شک محدود علاقے تک ہی اثر انداز ہوئی تھی۔ لیکن تب بھی حکومت نے اس کو برداشت نہیں کیا۔ اس لئے یہاں ایک ریاست گیر تنظیم کی ازحد ضرورت تھی۔ جس کا تعلق براہِ راست کسی ترقی پسند ملکی جماعت کے ساتھ ہوتا۔ تاکہ ریاستی سرکار اسی کو دبانے میں ذرا محتاط بن جاتی۔ ریاست گیر جماعت نہ صرف ان معنوں میں کہ یہ ساری ریاست میں پھیلی ہو۔ بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ ایسی تنظیم کی سیاست ہر طبقے اور ہر فرقے کو قابلِ قبول ہو۔ تاکہ ایسی جماعت ریاستی عوام کو صاف ستھری ایڈمنسٹریشن

دلانے کی جدوجہد میں ریاست کے ہر علاقے کے لوگوں کا تعاون حاصل کر سکتی اور ان کی ترجمان بننے کی اہل ہوسکتی۔ غرض یہ کہ ایسی جماعت ریاست کے تمام خطوں اور فرقوں کیلئے صحت مند سیاست کی نشان دہی کرتی۔

۱۹۵۳ء میں جب ریاست میں وزارتی تبدیلی کی وجہ سے شہری آزادی پر مزید روک لگادی گئی اور کمیونسٹ عنصر برسر اقتدار آنے لگا۔ تو اس کی پیشبندی کیلئے کسی ایسی موزوں جماعت کی ضرورت اور بھی محسوس کی گئی۔ ملک میں چونکہ شہری آزادی کے تحفظ اور کمیونزم کی مدافعت کیلئے پرجا سوشلسٹ پارٹی بھی صف آرا تھی۔ اس لئے بہتر یہ سمجھا گیا کہ ریاست جموں و کشمیر میں پرجا سوشلسٹ پارٹی کی شاخ قایم کی جائے تاکہ ایک تو ریاست میں کمیونسٹ اقتدار کا سدباب ہوسکے۔ اور دوئم ریاستی عوام کو حکومت کے آمرانہ رویہ سے نجات مل سکے۔ اور سوئم حکومت کی بدعنوانیوں اور بے ضابطگیوں کی کسی حد تک روک تھام ہوسکے۔ ریاست میں اس جماعت کا وجود عمل میں لانے کیلئے نیشنل کانفرنس کے اُس وقت کے کچھ پارلیمنٹ ممبران اور دیگر برگزیدہ اصحاب نے بھی اہم رول ادا کیا۔ ان میں مولینا محمد سعید مسعودی بھی شامل ہیں۔ آخرکار آل انڈیا پرجا سوشلسٹ پارٹی کے نیشنل ایگزیکٹو نے ریاست جموں و کشمیر میں اپنی شاخ قایم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اور ۱۹۵۴ء میں اس کی شاخ یہاں نامساعد حالات میں قایم ہوگئی۔ یہ پہلی کل ہند جماعت تھی۔ جس نے یہاں کے پُرخار میدان سیاست میں براہ راست قدم رکھنے کی جرأت کی۔ اس سلسلہ میں ریاستی سوشلسٹوں کی اولین کانفرنس شری اشوک مہتہ کی صدارت میں ۶، ۷، اور ۸ نومبر کو جموں میں منعقد ہوئی۔

ریاستی حکومت کو اس پارٹی کا قیام کسی صورت میں بھی گوارا نہیں ہوا۔ پرجا پریشد کو ختم کرنے کے لئے حکومت نے یہ پروپگنڈا کیا کہ یہ فرقہ وارانہ جماعت ہے۔ لیکن پرجا سوشلسٹ پارٹی تو فرقہ پرستی پر اعتقاد رکھتی نہیں ہے۔ اگر حکومت اور حکمران جماعت سچے دل سے یہ چاہتی۔ کہ ریاست میں فرقہ وارانہ جماعتوں کی حوصلہ افزائی نہ ہو۔ تو پھر حکومت اور برسر اقتدار جماعت کو ریاست میں پرجا سوشلسٹ پارٹی کے قیام کا خیر مقدم کرنا چاہئے تھا۔ ایسی جماعت کا قیام خود نیشنل کانفرنس اور عوام اور حکومت کے لئے سود مند تھا۔ لیکن وہ یہ اعلان سن کر بوکھلا اٹھے۔ کہ ریاست میں پرجا سوشلسٹ پارٹی کی شاخ قایم کی

جائے گی۔ نیشنل کانفرنس نے اس اعلان کی مذمت کر کے اس کو عملی جامہ پہنانے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی نے اس سلسلہ میں ایک قرار داد بھی منظور کی۔ جس میں درج ہے:۔

"یہ عناصر (سوشلسٹ) مختلف جماعتوں کی شکل میں آتے ہیں۔ کہیں جمہوریت کی نقاب ڈال کر جمہوری سوشلسٹ بنتے ہیں تو کہیں عوام کو فریب دینے کے لئے عوامی سوشلسٹ کہلاتے ہیں۔ ان کے نام مختلف ہیں مگر ان کا کام ایک ہی ہے۔ انتشار انگیزی، جمہوری صفوں میں رخنہ ڈالنا اور سامراج کو مدد دینا۔"

ریاست میں پرجا سوشلسٹ پارٹی کی شاخ قائم کی جانے کی طرف اشارہ کر کے نیشنل کانفرنس کی متذکرہ صدر قرار داد میں سوشلسٹوں کو "تخریب پسند عناصر" سے مشابہت دے دی گئی تھی۔

"گذشتہ دنوں ہندوستان کی ایک سیاسی پارٹی کے بعض لیڈروں نے بھی ان تخریب پسند عناصر (سوشلسٹوں) کو شہ دی ہے۔ اور اب یہ چرچا بھی ہو رہا ہے کہ کسی پُر فریب نام سے ہماری ریاست میں ایک نئی سیاسی پارٹی قائم کی جائے گی جو براہِ راست یا بالواسطہ ہندوستان کی پارٹی سے ملحق ہو گی مگر ہمیں اعتماد ہے کہ ہمارے عوام ان سیاسی اچکوں کو شکست فاش دیں گے۔"

آگے چل کر مذکورہ قرار داد میں یہ سجھاؤ رکھا گیا تھا۔ کہ ہندوستان کی ایسی جماعتیں جو کشمیر کی قومی تحریک کی یکجہتی قائم رکھنے میں ہمدردی رکھتی ہوں وہ نیشنل کانفرنس اور اس کی حکومت کی حمایت کریں۔ یہ اشارہ غالباً کمیونسٹ پارٹی اور کانگریس کی طرف تھا۔ اسی سلسلہ میں ملک کی دیگر جماعتوں سے ریاست کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دینے کی اپیل کی گئی تھی۔ تاکہ ریاستی حکمران کشمیر اور باقی ملک کے درمیان امتیازی رجحان اور علیحدگی کا ماحول بنائے رکھ کر اپنی من مانیوں، بدعنوانیوں اور بے ضابطگیوں کو بلا کسی مداخلت کے جاری رکھ سکیں۔ اس بارے میں آگے چل کر محولہ بالا قرار داد میں مقامی سوشلسٹ خیالات رکھنے والوں کو شر پسند اور خود غرض کہہ کر بیان کیا گیا ہے

"اس کے علاوہ ہم توقع کرتے ہیں کہ ہندوستان کی وہ جماعتیں، جو ہماری

قومی تحریک سے ہمدردی رکھتی ہیں۔ ہماری اس تحریک کی یک جہتی قائم
رکھنے میں ہماری مدد کریں گی۔ انہوں نے آج تک کشمیر کے مسئلے کو ایک قومی
مسئلہ قرار دے کر وقتی رنجشوں اور اختلافات کو نظر انداز کیا ہے۔ اور
کشمیر کے اندرونی معاملات میں دخل دینے سے اجتناب کرتی رہی ہیں۔
ہمیں توقع ہے کہ وہ آئندہ بھی اس بات کا خیال رکھیں گی۔ اور مقامی
شرپسند اور خود غرض افراد کی حوصلہ افزائی نہیں کریں گی۔"

مندرجہ بالا سطور سے ظاہر ہے کہ نیشنل کانفرنس ریاست میں کسی بھی ہندوستانی جماعت کے وجود کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتی تھی۔ پرجا سوشلسٹ پارٹی کی جو افتتاحی کانفرنس جموں میں منعقد ہوئی۔ اس میں شامل ہونے والے کارکنوں کی راہوں میں کافی اڑچنیں پیدا کی گئیں۔ اور انہیں تنگ کیا گیا۔ اس کانفرنس میں شمولیت کرنے سے روکنے کیلئے کئی کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ جس کا تذکرہ اس وقت کے پرجا سوشلسٹ لیڈر شری اشوک مہتہ نے اپنی تقریر کے دوران اس کانفرنس میں کیا تھا۔

"دو دن سے آپ کے مشہور شہر میں سوشلسٹ کانفرنس ہو رہی ہے ...... کئی کارکن آنا چاہتے تھے۔ مگر ان میں سے چالیس پچاس گرفتار ہو چکے ہیں۔ ان کا قصور یہی تھا کہ وہ اس کانفرنس میں شامل ہونا چاہتے تھے۔ تاکہ ریاست کی ترقی اور مستقبل کو روشن کرنے کیلئے کچھ عملی فیصلے کریں۔ لوگوں کی خدمت کیلئے، بغاوت کیلئے نہیں۔ وہ کھلے عام فیصلہ کرنے کیلئے اکٹھا ہونا چاہتے تھے۔ لیکن عجیب و غریب بات ہے کہ ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ جو یہاں پہونچے ہیں۔ ان کے پیچھے پولیس دوڑتی ہے۔ شاید یہاں سے واپس جائیں گے۔ تو انہیں گرفتار کرنے کیلئے سوچا جا رہا ہو۔" [۵۱]

ان حالات میں پرجا سوشلسٹ پارٹی کا انعقاد ریاست جموں کشمیر میں ہوا۔ جمہوریت کا تقاضا تھا کہ کوئی صحتمند اپوزیشن پارٹی قائم ہو جائے شری اشوک مہتہ نے اپنی متذکرہ تقریر میں مزید کہا۔

---

۵۱ اخبار "سپیح" جموں ۱۲ نومبر ۱۹۵۱ء

"مجھے دکھ ہوا ہے۔ جموں و کشمیر میں گرفتاریاں ہوتی ہیں۔ عدالت کے
سامنے ملزموں کو کھڑا نہیں کیا جاتا۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ جب تک
لوگوں کو پورا ادھیکار نہیں ملے گا۔ کشمیر کی ترقی نہیں ہو سکتی ......
یہ بات بھی عجیب ہے کہ ریاست میں پارٹی اور سرکار ایک ہو رہی ہے
سرکار کے ملازموں کو پارٹیوں کے ساتھ تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ وہ تو
خدمت گار ہیں۔ سب کی خدمت کریں۔ صرف سرکاری پارٹی کی مدد کرنا
ریاست کی ترقی کی بات نہیں ہے۔ جمہوریت میں ایک سے زیادہ
پارٹیاں ہونی چاہئیں۔ اس سے حکومت پر لگام رہتی ہے۔ یہ لگام
ضرور رہنی چاہیے ...... کبھی جموں کے نام پر کشمیر کے عوام
کو کچلا جاتا ہے۔ کبھی کشمیر کے نام پر جموں کو۔ ہمیں ایک دوسرے کے
ہاتھ میں ہاتھ ملا کر کام کرنا چاہیے۔"[1]

جموں میں کانفرنس ختم ہونے کے بعد شری اشوک مہتہ اپنی پارٹی کے ہمراہ سرینگر روانہ ہو گئے۔ لیکن حکومت اور حکمران جماعت کی طرف سے ان کے خلاف زبردست مظاہرہ کرایا گیا۔ یہاں تک کہ ان کا سرینگر پہونچنا مشکل بنا دیا گیا۔ وادیٔ کشمیر میں داخل ہوتے ہی قاضی گنڈ سے برابر ان کے خلاف طوفانِ بدتمیزی بپا کیا گیا۔ حسب پروگرام سرینگر کے گاندھی پارک میں شری اشوک مہتہ کو ایک پبلک جلسہ میں تقریر کرنی تھی۔ لیکن تقریر کرنا تو درکنار، وہ تو بال بال بچ گئے۔ گاندھی پارک کے بالمقابل نمائش گاہ بلڈنگ میں سول کپڑوں میں ملبوس بد نام "پیس بریگیڈ" کے جوانوں کو ہلڑ بازی کرنے اور جلسہ کو ناکام بنانے کی غرض سے جمع کر رکھا گیا تھا۔ اور ان میں سے کچھ گاندھی پارک کے اردگرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔ جو کوئی وہاں تقریر سننے کے خیال سے آتا۔ تو یہ اس کو دانت دکھاتے۔ اور وہ بھاگ جاتا۔ شری اشوک مہتہ اور ان کی پارٹی کے سری نگر پہنچنے پر ان کے خلاف زبردست مظاہرہ کرایا گیا۔ ان کا سرینگر میں راہ چلنا بھی دشوار ہو گیا۔ اس وحشیانہ سلوک میں کچھ کمیونسٹ نواز بھی پیش پیش تھے۔ اس پارٹی کو امیرا کدل میں خوب مار پیٹ کی گئی۔ ان کے کپڑے اتار

۱؎ اخبار "پرچم" جموں مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۵۵ء

لئے گئے۔ اور ان کے بازؤں میں پہنی ہوئی گھڑیاں چھین لی گئیں۔ پارٹی کی ایک لیڈی ممبر شریمتی وسنتی شروف کے ساتھ بھی انتہائی شرمناک سلوک کیا گیا اور ان کا شال وغیرہ جبراً چھین لیا گیا۔ اس پارٹی کے بیشتر آدمی زخمی ہو گئے۔ اس پر تعجب یہ کہ پولیس کے کچھ افسران اس سارے نظارے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

مسٹر شیخ محمد عبداللہ اور ان کے بہت سارے ساتھی اس دوران جیلوں میں نظربند تھے۔ پرجا سوشلسٹ پارٹی نے غیر جانبدارانہ اور حقیقت پسندانہ پالیسی اختیار کر کے جمہور نوازی کا ثبوت دیدیا۔ اور یہاں آغاز کے ساتھ ہی سیاسی لیڈروں اور کارکنوں کو مقدمہ چلائے بغیر جیل میں نظربند رکھنے کی شدید مخالفت کی۔ اس لئے سیاسی کارکنوں کی ایک خاصی تعداد یا تو پرجا سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہو گئی۔ یا اس کی ہمدرد بن گئی۔ اس صورت حال کو دیکھ کر اقتدار پرست گھبرا گئے اور انہوں نے پرجا سوشلسٹ پارٹی کو ختم کرنے کے منصوبے باندھے۔ اس وقت کے وزیر اعظم مسٹر بخشی غلام محمد کی چالاکی اور مسٹر مرزا محمد افضل بیگ کی مساعی سے پرجا سوشلسٹ پارٹی کو زک پہونچ گئی۔ بخشی صاحب نے پرجا سوشلسٹ پارٹی کی صفوں میں انتشار ڈالنے کیلئے بیگ صاحب کی خدمات بھی حاصل کر لیں۔ اور انہیں اسی خیال سے عارضی طور پر کچھ مدت کیلئے جیل سے رہا کر دیا۔ اس امر کے باوجود بھی کہ پرجا سوشلسٹ پارٹی قضیہ کشمیر کے سلسلے میں ریاستی اور مرکزی سرکار کی مخالف تھی۔ اور شیخ صاحب اور دوسرے مقید رہنماؤں اور کارکنوں کی حمایت کرتی تھی۔ بیگ صاحب نے کھلم کھلا پرجا سوشلسٹ پارٹی کے خلاف یلغار کیا۔ اور اس پارٹی کے خلاف زہر پھیلایا اور پوسٹر بھی چھپوا دیا۔ پرجا سوشلسٹ پارٹی کی ابھرتی ہوئی طاقت اور بڑھتی ہوئی مقبولیت کو زک پہنچانے کی غرض سے مسٹر افضل بیگ نے علیحدہ تنظیم "محاذ رائے شماری" کا قیام اسی دوران میں زیر عمل لایا۔

بخشی صاحب، صادق صاحب اور ان کی حکمران جماعت نے پرجا سوشلسٹ پارٹی کے قیام کو اپنے لئے ایک خطرہ عظیم سمجھ لیا۔ اس لئے انہوں نے مرکزی سرکار اور ہندوستان نواز عناصر کی نظروں میں اس جماعت کی قدر و منزلت کم بلکہ ختم کرنے کی نیت سے اس بات کی تشہیر کرنا شروع کر دی کہ پرجا

سوشلسٹ پارٹی نے ہندوستانی کاز کو کمزور بنا کر ملکی مفادات کو نقصان پہنچایا۔ اور شہری آزادی کے تحفظ کی خاطر میدان کارزار میں کود کر ہندوستان مخالف عناصر کا ہاتھ مضبوط بنا لیا۔ اس طرح سے محاذ رائے شماری کے قیام کی پیشرو بن کر ملک دشمن عناصر کو منظم ہونے کا موقع بہم پہنچایا۔ پرجا سوشلسٹ پارٹی کی عجیب پوزیشن ہو گئی۔ اور اس کے متعلق مختلف قسم کی چہ میگوئیاں پھیلائی گئیں، صوبہ جموں کے ہندو اس کو پاکستان اور مسلم نواز جماعت سمجھ بیٹھے۔ اور وادی کشمیر کے مسلمان ہندوستانی جماعت کی شاخ ہونے کے ناطے اسے ہندو نواز جماعت تصور کر بیٹھے۔ نیتجہ نکلا۔ کہ پارٹی کمزور ہو گئی۔

پرجا سوشلسٹ پارٹی کو اگرچہ مورد الزام ٹھہرائے کی کوششیں کی گئیں لیکن یہاں کے ترقی پسند، جمہور نواز اور غیر فرقہ وارانہ عناصر حکمران جماعت پر الزام تراشی کرنے لگے کہ بخشی صاحب، صادق صاحب اور ان کے ساتھی نہیں چاہتے تھے کہ کشمیر میں صحتمند جمہوری ماحول قائم ہو۔ اور ہندوستان کی جمہوریت کی صحیح تصویر کشمیر میں پیش ہو سکے۔ اور نہ اس کا فیض اہل کشمیر کو حاصل ہو سکے۔ اس عظیم فرض کو ادا کرنے کیلئے پرجا سوشلسٹ پارٹی میدان عمل میں اتر آئی تھی لیکن بخشی صاحب، صادق صاحب اور ان کے دیگر ساتھی کشمیر میں ترقی پسند اور غیر فرقہ وارانہ سیاست کو پنپتا دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ اور پردہ آہنی کے پیچھے کراہتے ہوئے کشمیر کی آواز کو دبانے کی کوشش کر کے پرجا سوشلسٹ پارٹی جیسی ترقی پسند اور جمہور نواز جماعت کو اس کا ترجمان بننے نہیں دینا چاہتے تھے۔ اسلئے اس سیاسی خلاء کو پورا کرنے سے باز رکھنے کیلئے اور ریاستی سیاست کو صحیح موڑ لینے میں حایل ہو جانے کیلئے سیاسی ریشہ دوانیاں عمل میں لائیں۔ اس غرض کیلئے مسٹر بخشی غلام محمد نے بیگ صاحب کو آلہ کار بنا لیا۔ ان کو اسمبلی کی نشستوں میں شمولیت کرنے کے بہانہ سے مصلحتاً عارضی طور جیل سے رہا کر دیا۔ اور ان تک پرجا سوشلسٹ پارٹی کا توڑ پیدا کرنے کی شہ پہنچا دی۔ چنانچہ مسٹر افضل بیگ نے محاذ رائے شماری کا قیام عمل میں لا کر پرجا سوشلسٹ پارٹی کے بیشتر کارکنوں میں ہندوستان کے خلاف منافرت پھیلا کر اور جذبات ابھار کر ان کو محاذ رائے شماری میں شامل کرا دیا۔ ان ایام کے ممبر اسمبلی اور پرجا سوشلسٹ پارٹی کے اہم رکن اور

موجودہ منسٹر مسٹر عبدالغنی گونی بھی محاذ رائے شماری میں چلے گئے۔

پرجا سوشلسٹ پارٹی نے تب بھی اپنی فراخدلی کا مظاہرہ کر کے اور شہری آزادی کے تحفظ کیلئے اس مفہوم کی ایک قرار داد منظور کر لی کہ محاذ رائے شماری کا ممبر بیک وقت پرجا سوشلسٹ پارٹی کا بھی ممبر رہ سکتا ہے۔ لیکن چونکہ حکمران جماعت اور بیگ صاحب کی کوششیں تھیں۔ کہ پرجا سوشلسٹ پارٹی کو ختم کیا جائے۔ اسلئے شہری آزادی کے حصول اور صحتمند سیاست کے پھیلاؤ کیلئے پرجا سوشلسٹ پارٹی کے تاریخی رول اور جدوجہد کے باوجود بھی اس پارٹی کے وجود کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔

"ریاست میں شہری آزادی اور جمہوری حقوق کی بحالی کیلئے جدوجہد سے نہ صرف انسانی آزادی میں ہمارے اعتقاد کا پتہ چلتا ہے۔ بلکہ اس سے حب الوطنی کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ کیونکہ پرجا سوشلسٹ پارٹی سیکولرازم، جمہوریت اور سوشلزم کی قدروں کیلئے جس جدوجہد کی علمبرداری کرتی ہے۔ وہ جدوجہد دراصل ہمسایہ ملکوں کے نظریہ کے مقابلے میں ہندوستانی نظریات کی کامیابی کے واسطے ہی ہے۔ ایک ایسی ریاست میں جہاں آدمیوں کے فرق بڑھ رہے ہیں۔ جہاں گلوگیر پابندیوں نے فضا کو پراگندہ کر دیا ہو۔ جہاں علاقہ پرستی و فرقہ داری کی برائیاں سر اٹھا رہی ہوں اور جہاں سیاسی بدعنوانیاں سارے اخلاقی ڈھانچے کو کھوکھلا کر رہی ہوں۔ لوگوں کو شمال اور مغرب کے نت نئے خطروں کا مقابلہ کرنے کیلئے ابھارا نہیں جا سکتا۔ اس نازک گھڑی میں اس بات کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے کہ ریاست میں ایک بار پھر رائے عامہ کی سربراہی اور فوقیت کو قائم و دائم رکھنے کیلئے شدت کے ساتھ جدوجہد کی جائے" [1]

شومئی قسمت دیکھئے کہ اب کچھ سال پیشتر موجودہ بخشی نیشنل کانفرنس اور پرجا سوشلسٹ پارٹی کے درمیان ادغام کی بات چیت جاری تھی۔ اگرچہ ادغام نہ ہو سکا۔ تاہم ان دونوں پارٹیوں کے درمیان قریبی تعلقات پیدا ہو گئے۔

---

[1] جموں و کشمیر پرجا سوشلسٹ پارٹی کا انتخابی منشور ۱۹۶۲ء

پرجا سوشلسٹ پارٹی کے رہنما شری ایچ ۔ وی ۔ کامتھ اور جنرل سیکریٹری شری پریم بھسین نیشنل کانفرنس رہنماؤں کی دعوت پر ان سے بات چیت کرنے کے لئے جب سرینگر تشریف لائے تھے تو ۱۵ ؍ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو میں نے ایک مقامی ہوٹل میں ان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ تقریب کا اہتمام کیا۔ اس میں میں نے ایک مختصر سی تقریر کی۔ جس کی تفصیل ایک مقامی اخبار میں یوں چھپی تھی۔

"تقریب کے شروع میں پرجا سوشلسٹ پارٹی کی مقامی شاخ کے سیکریٹری مسٹر پیارے لال کول نے ایک مختصر سی تقریر کی۔ جس میں آپ نے معزز مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے ریاست کے موجودہ سیاسی اور اقتصادی حالات پر تبصرہ کیا۔ آپ نے کہا۔ صادق سرکار کی غلط اور ناعاقبت اندیش پالیسیوں کے نتیجہ میں ریاست کے اندر زندگی کے تمام شعبوں پر جمود چھا گیا ہے۔ آپ نے کہا۔ جمہوریت نام کی کوئی چیز ریاست میں موجود نہیں۔ پچھلے عام انتخابات میں اگر برسر اقتدار پارٹی دھاندلیاں نہ کرتی۔ تو حالات بالکل مختلف ہوتے۔ شری پیارے لال نے معزز مہمانوں کو یقین دلایا کہ وہ اور ان کے ساتھی ریاست میں شہری اور جمہوری آزادیاں بحال کرنے کی جدوجہد کو منظم اور تیز کردیں گے۔" [۵]

اس تقریب میں ان دونوں رہنماؤں نے اعلان کیا کہ نیشنل کانفرنس پرجا سوشلسٹ پارٹی کے بالکل قریب آگئی ہے بلکہ اب یہ اس پارٹی سے علیحدہ نہیں ہے۔ بخشی صاحب نے اس تقریب پر اظہار کیا۔ کہ "اب سے میں پرجا سوشلسٹ پارٹی کا ہوں اور پرجا سوشلسٹ پارٹی میری جماعت ہے" اس طرح سے ان دو جماعتوں کے اشتراک عمل کا اعلان ہوا۔ نیشنل کانفرنس کارکنوں نے پرجا سوشلسٹ پارٹی کے ساتھ نیشنل کانفرنس کا اشتراک عمل اور قریبی رابطہ قائم کرنے کا خیر مقدم کیا۔ سمبل میں منعقدہ ایک اجلاس میں جو

---

۵ اخبار "نوائے کشمیر" سرینگر مورخہ ۱۷ / اکتوبر ۱۹۶۶ء

اقدام کا گرمجوشانہ خوش آمدید کیا گیا۔

"ایک قرار داد کے تحت اس اعلان کا خیر مقدم کیا گیا جو پچھلے روز جناب بخشی غلام محمد اور شری کامتھ نے نیشنل کانفرنس اور پرجا سوشلسٹ پارٹی کو ایک دوسرے سے ملانے کیلئے کیا۔ قرار داد میں کہا گیا کہ موجودہ حالات میں برسر اقتدار حکومت کی دھاندلیوں کے لئے ہم خیال اپوزیشن پارٹیاں ایک دوسرے کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھائیں" ۱؎

ان تعلقات کو استوار بنانے کی غرض سے بعد میں کچھ اسمبلی نشستوں کیلئے منعقد ہوئے ضمنی انتخابات میں نیشنل کانفرنس کی حمایت کرنے کی غرض سے پرجا سوشلسٹ لیڈر شری ترویدی اور پارٹی کے کچھ اور ممبران پارلیمنٹ یہاں وارد ہوئے۔ میں نے بھی نیشنل کانفرنسی امیدواروں کے حق میں بیان دے دیا۔

"پرجا سوشلسٹ پارٹی نے اسمبلی کے پانچوں حلقوں میں نیشنل کانفرنس کے امیدواروں کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ اشتراک اسلئے نہیں کہ پرجا سوشلسٹ پارٹی نے نیشنل کانفرنس کے ساتھ نزدیکی رابطہ قائم کیا ہے بلکہ اس لئے بھی کہ کشمیر کے اندر جمہوری اور سیکولر قوتوں کو تقویت ملے۔۔۔۔۔۔ مجھے امید ہے کہ انتخابات کو آزادانہ ماحول میں عمل میں لانے کیلئے تمام انتظامات کئے جائیں گے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ایک بار پھر ہندوستان کی جمہوریت ایک بھاری شکل میں ریاستی عوام کے سامنے ظاہر ہو جائے گی" ۲؎

ان ضمنی انتخابات میں بھی حکومت کی طرف سے حسب سابق دھاندلیوں کا سہارا لیا گیا۔ دو پارٹیوں کے اشتراک کی وجہ سے

۱؎ اخبار "نوائے کشمیر" سرینگر مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۶۸ء

۲؎ اخبار "دیش" سرینگر مورخہ ۱۹ اپریل ۱۹۶۹ء

نیشنل کانفرنس لیڈروں بخشی صاحب اور صراف صاحب کی فریاد پر پرجا سوشلسٹ لیڈر شری ناتھ پائی مرحوم نے پارلیمنٹ میں فوراً اس کے خلاف زبردست آواز اٹھائی۔ اور حکومت پر الزام لگایا کہ وہ کشمیر میں ہونے والے ضمنی انتخابات میں حکمران کانگریس کے مفادات کو تقویت دینے کے لئے سرکاری مشینری کا استعمال کر رہی ہے

"آپ نے کہا کہ ریاست میں پچھلے انتخابات کی تاریخ ایسی ہے کہ اس سے اعتماد نہیں ابھرتا ہے۔ جو چھ انتخابات وادی میں ہونے والے ہیں۔ ان سے اس بات کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ کہ بے ضابطگیاں ہوئیں۔ جو کہ پچھلے عام انتخابات میں ہوئی ہیں .... جموں وکشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ملک میں جمہوری نظام قائم ہے۔ اس لئے کوئی ایسی حرکت نہیں ہونی چاہئے۔ جس سے جمہوریت پر ان لوگوں کا اعتماد متزلزل ہو جائے۔" [۵]

لیکن بخشی صاحب تو خود اب حکمران کانگریس کے ممبر بن چکے ہیں۔ اگرچہ کانگریس اور نیشنل کانفرنس کے تعلقات مخدوش ہیں۔ تاہم نیشنل کانفرنس کو اب حکمران کانگریس میں مدغم کرنے کی قرارداد ہے۔

پرجا سوشلسٹ پارٹی کے قیام کے بہت عرصہ بعد دوسری ملکی جماعتوں کی شاخیں بھی ریاست جموں وکشمیر میں قائم ہو گئی ہیں۔ جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ملکی سیاست کے اتار چڑھاو سے ریاستی عوام اپنا دامن بچا نہیں سکتے ہیں۔ ریاست میں آج سوشلسٹ پارٹی کے علاوہ کانگریس تنظیم۔ حکمران کانگریس، جن سنگھ، ہندو مہاسبھا، کمیونسٹ پارٹی اور سوتنترا پارٹی کی شاخیں بھی قائم ہیں۔ نیشنل کانفرنس کا بڑا حصہ

---

(۵) اخبار "اسٹیٹسمین" نئی دہلی مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۶۹ء

حکمران کانگریس میں تبدیل ہوگیا ہے۔ اب تو خیر پرجا سوشلسٹ پارٹی اور سنڈیکٹ سوشلسٹ پارٹی کے ادغام سے سوشلسٹ پارٹی کا وجود ظہور میں آیا ہے۔ پرجا سوشلسٹ پارٹی کو سوشلسٹ پارٹی میں تبدیل کر کے ریاست جموں و کشمیر میں سوشلسٹ پارٹی کی شاخ قایم ہوگئی ہے۔ جموں کے چند ایک ساتھیوں کے ساتھ اختلاف پڑنے پر میں اس کی ممبری سے مستعفی ہوا ہوں اور میرے ساتھ کشمیر کے سارے ساتھی اب راس سے علیحدہ ہوگئے ہیں۔ گو کہ مجھے آل انڈیا سوشلسٹ پارٹی کے چیرمین شری کرپوری ٹھاکور اور جنرل سیکرٹری شری ڈھنڈوتی نے پارٹی میں بدستور رہنے کی اپیل بھی کی ہے۔ لیکن میں بدستور اپنے فیصلہ پر کاربند ہوں۔ اور زمانہ طالب علمی سے سوشلسٹ تحریک کے ساتھ عرصہ دراز تک وابستہ رہنے کے بعد پارٹی سے علیحدہ ہوگیا ہوں۔ اس طرح سے آج کل وادی کشمیر میں سوشلسٹ پارٹی کی شاخ ٹوٹ گئی ہے۔ اور یہ اب جموں کے صرف چند ساتھیوں تک محدود رہ گئی۔

شہری آزادی پر پہرے

"عوامی راج" کے قیام کے ساتھ عوام کو جو امیدیں وابستہ تھیں۔
وہ ماضی کی ایک تلخ یاد بن کر رہ گئیں۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں شخصی راج تو
ختم ہوگیا۔ لیکن اس کی جگہ ایک نئی آمریت قایم ہوگئی۔ جو جمہوری تقاضوں
کو آج تک پورا نہ کرسکی۔ غنڈہ گردی میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ عوام
کے سیاسی نقل و حمل کو ناممکن بنا دیا گیا۔ مسٹر شیخ عبداللہ نے سنہ ۱۹۵۲ء
میں آئین ساز اسمبلی کے انتخابات کے دوران جس طرح عوام کی رائے
کو کچل کر رکھ دیا۔ اور انہیں آزادانہ ماحول میں انتخابات لڑنے کا موقع
فراہم نہ کیا۔ وہی رویہ بدستور آج تک کی حکومتوں نے اپنایا۔ سنہ ۱۹۵۶ء
میں میونسپل کونسل سری نگر کے جو انتخابات ہوئے۔ اس میں حکمران جماعت
کے نامزدہ افراد کے خلاف کچھ امیدوار انتخاب لڑنے کیلئے کھڑا ہوئے
تھے۔ بعض امیدواروں کے کاغذات نامزدگی جانچ پڑتال کے دن
ہی مسترد کرائے گئے۔ ان میں سے ایک امیدوار نے انتخابی عذرداری
بھی دائر کی۔ جو فاضل جج نے منظور بھی کی۔ لیکن بہت عرصہ گذرنے
کے باوجود بھی اس خالی نشست کا انتخاب آج تک نہیں کرایا گیا۔

اس پر طرّہ یہ کہ منتخب شدہ میونسپل کونسل کو اب کئی سالوں سے
برخاست کیا گیا ہے۔ اور مدت مدید گزرنے کے باوجود بھی میونسپل کونسل
کے انتخابات سرینگر اور جموں میں نہیں کرائے جاتے ہیں۔ بلکہ اب تقریباً
باراں سالوں سے سرکاری نامزدہ ایڈمنسٹریٹر کو سرینگر اور جموں کی

میونسپلٹیوں کے قضا و قدر کا مالک بنا دیا گیا ہے۔ اور وقت وقت پر اپنے منظور نظروں کو اس عہدے پر فائز کیا جاتا ہے۔ جن چند نشستوں پر پہلے مقابلہ ہو گیا۔ وہاں مخالف امیدواروں اور ووٹروں کے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا کہ خدا کی پناہ۔ حکمران جماعت کی دھاندلی اور ہلڑ بازی اس میونسپل الیکشن میں انتہا کو پہونچ گئی۔ حکومت نے پچھلے میونسپل انتخابات کرانے میں بھی ایک مدت تک لیت و لعل کیا۔ اور جو انتخابات کرائے تو دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے۔ مقابلہ کرنے والے امیدواروں میں پرجا سوشلسٹ پارٹی اور ریوک سبھا کے امیدوار بھی شامل تھے۔ ووٹ ڈالنے کے دن نیشنل کانفرنس نے ووٹروں میں دہشت پھیلانے کے لئے اپنے غنڈے آگے چھوڑ دئے۔ جنہوں نے مخالف امیدواروں اور ان کے انتخابی ایجنٹوں اور معاونوں کی خوب مرمت کی۔ اور ووٹروں سے بیلٹ پیپر چھین کر خود ان کے ووٹ حکمران جماعت کی صندوقچیوں میں ڈالے۔ وحشیانہ سلوک نہ صرف مرد ووٹروں کے ساتھ ہی روا رکھا گیا۔ بلکہ ووٹ ڈالنے کیلئے آئی ہوئی خواتین کو بھی ناروا سلوک کا شکار بنایا گیا۔ اور امن عامہ کے خداوندان تماشہ دیکھتے رہے۔ ان خواتین میں بیشتر تعداد کشمیری پنڈتانیوں کی تھی۔ جو اپنے جمہوری حق کا استعمال کرنے کیلئے باہر آئی تھیں۔ ان روح فرسا حالات کے پیش نظر مخالف امیدواروں نے "پولنگ" کے دوران انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔ انہوں نے ان تشدد انگیز، جمہور کش بدعنوانیوں اور بے ضابطگیوں کے بارے میں ہندوستان کے وزیر اعظم وقت پنڈت نہرو اور وزیر داخلہ کو احتجاجی تار بھیج دئے۔ جس میں اس جمہور کش اور تشدد انگیز رویہ کی پوری چھان بین کرنے کی التجا کی گئی تھی۔ لیکن دھاندلیوں کو بے نقاب نہ کرانے کی کوشش کر کے اس کو مزید مجرمانہ فعل سرزد کرنے کی بالواسطہ طور کھلی ڈھیل دیدی۔ شہری آزادی کے نام پر حکمران جماعت نے عوام کی شہری آزادی کا گلا دبوچ لیا۔ یہاں تک کہ اس غنڈہ گردی کا جائزہ لینے والے اخبار نویسوں کو بھی نہیں چھوڑا گیا۔

اس تشویشناک صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے ایک اداریئے میں روزانہ "مارتنڈ" سرینگر نے لکھا۔

"ریاست میں موجودہ انتخابات نے لوگوں کی آنکھیں کھول دی ہیں اور وہ حکومت کے جمہوری ہونے کے دعویٰ کو کھوکھلا سمجھنے لگے ہیں۔ اب یہ کھلم کھلا کہا جا رہا ہے کہ سرینگر میں میونسپل انتخابات مبنی بر انصاف اور غیر جانبدار نہیں تھے۔ رائے دہندگان کو دہشت زدہ کیا گیا۔ جعلی ووٹوں کا آزادی کے ساتھ استعمال کیا گیا۔ اور ووٹروں کیساتھ بری طرح پیش آ کر انہیں بے رحمی کیساتھ پیٹا گیا۔ اور بہت سے تو سخت زخمی ہو گئے۔ یہاں تک کہ مخالف امیدواروں کو بھی نہیں چھوڑا گیا اور انہیں سفاکانہ اذیت اور دہشت کا شکار بنایا گیا اخباری نمایندوں کو بھی بری طرح سے پیٹا گیا.... دنیا اب اس بات سے اچھی طرح باخبر ہوگئی کہ حکومت کا یہ دعویٰ کہ وہ جمہوریت اور شہری آزادی کی محافظ ہے بالکل غلط اور بے بنیاد ہے" [1]

ان بھیانک حالات کو دیکھ کر ایک اور مقامی اخبار نے ایسے رجحان کو خطرناک قرار دے دیا۔

"تنظیم (نیشنل کانفرنس) میں جو خطرناک حالات پائے جاتے ہیں۔ (؟) کا اندازہ اس ایک مثال سے لگایا جا سکتا ہے کہ ووٹ ڈالنے کے دن بھی تنظیم کے کچھ غنڈوں نے ووٹ ڈالے جانے والی جگہوں پر بد تمیزی کی....... ایسی حرکتیں کبھی بھی جمہوریت کی نشو و نما کیلئے سودمند ثابت نہیں ہوتیں....... جمہوریت کا تقاضا ہے۔ کہ سیاسی مخالفین کا مقابلہ ڈنڈوں اور دہشت زدگی سے نہیں بلکہ سیاسی طور طریقوں سے کیا جائے۔" [2]

ایسے ہی حربوں کو جموں کی میونسپل کونسل کے انتخابات میں بھی استعمال کیا گیا۔ اور اپوزیشن کو ہر لحاظ سے دبانے کی کوشش کی گئی۔

---

[1] منقول از شیخ عبداللہ صادق خط و کتابت صفحہ نمبر ۲۱
[2] منقول از عبداللہ صادق خط و کتابت صفحہ نمبر ۲۱

اس کے بعد ریاستی اسمبلی کے جو انتخابات ۱۹۵۷ء میں کرائے گئے وہ بھی غیر جانبدارانہ ماحول میں نہیں ہوئے۔ اوّل تو لوگوں کے ذہن سے میونسپل انتخابات میں کی گئی غنڈہ گردی کے نقوش اتنے نہیں پاتے تھے کہ وہ اس انتخاب میں دلچسپی لیتے۔ دوئم جو افراد انتخاب لڑنے کیلئے کھڑا ہوئے۔ ان میں اکثر اصحاب کے کاغذات نامزدگی مسترد کرائے گئے۔ اور جہاں انتخاب لڑا بھی گیا۔ وہاں ووٹوں میں ہیرا پھیری ہوئی۔ سرکاری عملہ جو انتخابات کے سلسلہ میں متعین تھا وہ نیشنل کانفرنس کے زیر اثر تھا اور اس نے حکمران جماعت کی منشاء کے مطابق ہی کام کیا۔

۱۹۵۷ء میں صادق گروپ نے اسمبلی انتخابات کے بعد نیشنل کانفرنس سے علیحدگی اختیار کر کے ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں لایا۔ اسی سال لوکل باڈیز کے انتخابات ہوئے۔ لیکن اس انتخاب میں بھی وہی پرانا قابل افسوس وطیرہ دہرایا گیا۔ بیشتر مخالف امیدواروں کے کاغذات نامزدگی مسترد کرائے گئے۔ کچھ امیدواروں کے تجویز کنندگان ہی حبس میں رکھے گئے۔ سوپور میں کاغذات نامزدگیوں کی پڑتال کے دن خاص طور سے ہلڑبازی ہوئی۔ اور ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کے لیڈر مسٹر سید میر قاسم اور مسٹر غلام رسول رینزو کی زبردست مارپیٹ کی گئی۔ یہ دنگا و فساد حلقہ ہائے اسمبلی کے ضمنی انتخابات چرار شریف اور جاری بل میں بھی جاری رہا۔ اس کی مذمت کرتے ہوئے اس وقت کی ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کے صدر خواجہ غلام محمد صادق کو ریاست پر راشٹر پتی راج کے اطلاق کا مطالبہ کرنا پڑا۔ سید میر قاسم نے دہلی کی ایک پریس کانفرنس میں ان واقعات کے بارے میں بیان دے دیا۔

"آپ نے نیشنل کانفرنس پر الزام لگایا کہ اس نے نومبر کے لوکل باڈیز کے انتخابات کے سلسلے میں مخالف امیدواروں کے کاغذات نامزدگی میں ادل بدل کیا۔ آپ نے نیشنل کانفرنس

کے اس دعویٰ کو کہ اس نے ۹۰ فیصدی ووٹ حاصل کئے ہیں۔ محض ایک خیالی تصوّر قرار دیا"[۱]

آپ نے مزید بتایا کہ :-

"کشمیر میں کس سلسلہ کی بدعنوانیاں ہیں۔ ان میں زیادہ تر نکتہ چینی اس بات پر کی گئی۔ کہ اپوزیشن پارٹیوں کیلئے پنپنے کا کوئی موقع نہیں۔ آپ نے مثال دی کہ حال ہی میں پانچ لوکل باڈیوں کے جو انتخابات ہوئے ہیں۔ ان میں اپوزیشن پارٹیوں کے ۸۱ ممبر کھڑا ہوئے لیکن ۷۷ کاغذات نامزدگی ہی رد کردئے گئے۔ ضمنی انتخاب اسمبلی میں بھی سرکاری دباؤ اتنا زیادہ افسران پر ڈالا گیا کہ بطور پروٹسٹ ہمیں انتخاب سے ہٹنا پڑا"[۲]

اسمبلی انتخاب کے سلسلے میں راقم اور دوسرے ساتھی بھی اس دھاندلی کے ہتھے چڑھ گئے۔ ۱۹۵۷ء میں ضلع ڈوڈہ کے اسمبلی انتخابات باقی علاقوں کی نسبت موسم کی خرابی کی بناء پر کچھ تاخیر سے کرائے گئے۔ اس ضلع کے انتخابات میں حصہ

. . . .

لینے کے متعلق فیصلہ کرنے . . . . اور دیگر سیاسی حالات کا جائزہ لینے کیلئے رام بن میں ریاستی پرجا سوشلسٹ پارٹی کی ایگزیکٹو کی ایک میٹنگ منعقد ہونی مقرر تھی۔ اس سلسلہ میں سرینگر سے اس وقت کے پارٹی سیکریٹری آنجہانی خواجہ محمد عمر بٹ اور میں پارٹی کے کچھ دیگر ممبران شری دوارکا ناتھ جلالی، شری پران ناتھ در، شری محی الدین قاضی اور شری غلام محمد بٹ ۲۵ر اپریل ۱۹۵۷ء کو بطرف رام بن روانہ ہوگئے۔ ان دنوں پارٹی کی جموں شاخ کی طرف سے حلقہ انتخاب رام بن میں پارٹی کی انتخابی مہم جاری کی گئی تھی اور اس دن پارٹی کا انتخابی جلسہ رامسو میں منعقد ہو رہا تھا۔ یہیں رام بن جانے سے پہلے ہی پارٹی کے دیگر اراکین رامسو میں ہی مل گئے۔ اس لئے اعلان ہوا کہ پارٹی کی میٹنگ اور اگلا انتخابی جلسہ بانہال میں ۲۶ر اپریل کو منعقد

---

[۱] اخبار "ٹریبیون" مورخہ ۱۴ر دسمبر ۱۹۵۷ء [۲] اخبار "تیج" دہلی ۱۴ر دسمبر ۱۹۵۷ء

ہوگا۔ اُس زمانے میں علاقۂ بانہال حلقہ انتخاب اسمبلی رام بن میں شامل تھا۔ نتیجہ کے طور پر ہم واپس بانہال کی طرف لوٹ گئے۔ اس علاقے کیلئے نیشنل کانفرنسی امیدوار مرحوم خواجہ اسداللہ میر تھے۔ جو نائب وزیر ترقیات تھے۔

بانہال میں ہم ڈاک بنگلے میں ٹھہرے۔ شام کو نیشنل کانفرنس کے نامزدہ امیدوار اور نائب وزیر مسٹر اسداللہ میر بھی جموں سے آکر ڈاک بنگلہ میں ٹھہرے۔ میر صاحب کی شہ پر وہاں کے غنڈوں اور سرکاری اہلکاروں نے ہم سے نہایت ہی افسوسناک رویہ روا رکھا۔ باقی ساتھیوں کو کسی بھی ہوٹل میں ڈر کے مارے جگہ نہیں دے دی گئی۔ اور نہ ہی ان کو روٹی مل سکی۔ یہ حالت دیکھ کر رات کو انہیں بھی اپنے ساتھ ڈاک بنگلہ میں ٹھہرا دیا۔ ہوٹل والوں کو دھمکایا گیا۔ کچھ کارکنوں کی شدید مارپیٹ کی گئی۔ اور ان کے کپڑے و دوسری چیزیں چھین لی گئیں۔ جلسے کا خیال ترک کرنا پڑا۔ اور صرف میٹنگ منعقد کی گئی۔ اس کے بعد جموں کے ساتھی ۲۶ر اپریل کی صبح کو واپس جموں کی طرف روانہ ہوگئے۔ اور سرینگر کے ساتھی بھی واپس سرینگر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ ڈاک بنگلہ کے باہر سڑک پر سے زبردست مارپیٹ اور شور و غل کی صدائیں آنے لگیں۔ میں اور شری محی الدین قاضی باہر نکل آئے۔ تو دیکھا کہ رام بن علاقے کے چار راجپوت ساتھی اپنے گروپ سے بچھڑ کر بانہال میں ہی رہ گئے ہیں اور نیشنل کانفرنسی امیدوار کی طرف سے اکسایا گیا ایک ہجوم ڈنڈوں اور لاٹھیوں سے لیس وحشیانہ طریقے سے ان کی مارپیٹ کر رہا ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ وردی پوش سپاہی ان نہتے اور بے گناہ کارکنوں کو بچانے کی بجائے بدمست غنڈوں کی پیٹھ ٹھونک رہے تھے۔ بے دردی سے ان کارکنوں کی مارپیٹ لاتوں گھونسوں، اور لاٹھیوں سے کی گئی۔ بُری طرح سے ان کے بال نوچے گئے۔ پھر کیچڑ میں دبا کر ان کو لت پت کیا گیا۔ ان کے کپڑے پھاڑے گئے اور

روپے چھین لیئے گئے۔ ہماری ویگن کا ڈرائیور پٹرول ڈال کر آرہا تھا۔ تو اُس کو بھی گھیر لیا گیا۔ اور وہ مشکل سے خلاصی پاکر جموں کی طرف بھاگ گیا۔ اس اندھیر گردی پر افسوس ہوکر ہم دو ساتھیوں نے ڈاک بنگلے کے احاطہ سے نیچے سڑک پر جانے کی کوشش کی تو یکایک ہمارے سامنے بھی وحشی غنڈوں کی ایک ٹولی نمودار ہوئی۔ جس نے ہمارے راستے مسدود کردئے۔ اس بربریت کے شکار ہمارے یہ بے بس کارکن بڑی مشکل سے بھاگ جانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کی ہمت اور بہادری قابل تعریف تھی۔

اب ہمارے سری نگر پہونچنے میں ایک اور مشکل پیدا ہوگئی۔ اور وہ تھی گاڑی نہ ملنے کی۔ ہم سارے ساتھی ڈاک بنگلے کے کمرے میں نئی صورت حال پر سوچ بچار ہی کر رہے تھے۔ کہ غنڈوں کا ایک ہجوم ہمارے کمرے کی طرف لاٹھیاں، کلہاڑیاں اور چھریاں لے کر حملہ کرنے کی نیت سے بڑھ آیا۔ اور بدکلامی کی۔ ہم نے ان کو سمجھانے کی بہتیری کوشش کی۔ اور انہیں یقین دلایا کہ جونہی ہمیں سرینگر کیلئے گاڑی مل جائیگی۔ ہم واپس جائیں گے۔ وہ چلے گئے۔ لیکن پھر آتے رہے۔ اور ہمیں گالیاں نکالتے رہے اور تنگ کرتے رہے۔ یہ ماہ رمضان تھا۔ اس لئے روزوں کے دن تھے۔ جب سویرے ہم چائے پی رہے تھے تو وہ لڑائی کا بہانہ نکال بیٹھے اور کہنے لگے کہ تم سب کافر ہو اور کافروں کو ختم کرنا ہے۔ چنانچہ اسی وقت انہوں نے مذہبی جنون کو بڑھاوا دے کر مسلمان حاضرین کے مذہبی جذبات کو بھڑکا کر ہلڑ بازی شروع کی۔ ان غنڈوں کے منہ سے زور سے شراب کی بو آرہی تھی۔ اس ہجوم میں محکمہ سیڈ کے ملازم، پولیس کے بلا وردی اور باوردی ملازم اور دیگر سرکاری ملازم اور نیشنل کانفرنس کے کارکن شامل تھے۔ ظاہر ہے کہ حکمران جماعت نے ہمارے خلاف کیا کچھ سنگین تدابیر اور قاتلانہ اقدام کرادیئے۔ ملبری اور سبار محکموں کے ملازم، ویج لیول ورکر، فارسٹ گارڈ اور پولیس کے سپاہی ان منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کیلئے پیش پیش

تھے۔ آس پاس کے جمع شدہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کیا گیا تھا۔ سب سے زیادہ تعجب اس امر کا ہوا۔ کہ لاء اینڈ آرڈر کلیتاً ختم ہو چکا تھا اور صرف بربریت کا دور دورہ نظر آیا۔

بار بار سمجھانے کے باوجود بھی یہ غنڈے پے در پے حملے کر کے ہمارے کمرے میں جبراً داخل ہو جاتے۔ ان حالات کو دیکھ کر ہمارا تحفظ مشکل نظر آیا۔ ہمارا کمرے سے باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کم از کم اتنا تو احساس ضرور ہوا کہ وہ انسانوں کو قتل تو کر ہی لیں گے۔ لیکن انسانیت کو بھی قتل کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس لئے ہم سرکاری ڈاک بنگلے کے بند کمرے سے باہر نہ جا سکے اور حبس بیجا میں پڑے رہے۔ ہم ٹیلیفون یا تار کے ذریعے سے اس کی اطلاع تک کسی کو نہیں دے سکے۔ بلکہ کمرے میں خود کا نظر بند ہو گئے۔ ہمارے بھاگے ہوئے ڈرائیور کی زبانی راستے میں ہی اس وقت کے پارٹی چیرمین شری اوم پرکاش صراف اور ماسٹر روشن لال وغیرہ ساتھیوں کو اس افسوسناک واقعہ کی اطلاع ملی تھی۔ انہوں نے مکرکوٹ سے حالات دریافت کرنے کیلئے فوراً ایک تار بھیج دیا۔ اس کے بعد ہی ہمیں ایک پرائیویٹ ڈرائیور کے ہاتھوں حالات کی جانکاری حاصل کرنے کیلئے شری صراف کی ایک دستی چھٹی بھی ملی۔ لیکن ہم سرکاری غنڈوں کی حراست میں ہونے کے باعث شری اوم صراف اور پارٹی کے دوسرے ساتھیوں کے انتظار کے باوجود ان کو کوئی جواب نہ بھجوا سکے۔ کیونکہ ہمارے سارے ذرائع منقطع کئے گئے تھے۔

ہماری اس بے بسی کے عالم میں نیشنل کانفرنسی امیدوار اور نائب وزیر ترقیات سرکاری ڈاک بنگلہ پر پھر تشریف لائے اور ہمیں ان کا حکم پہنچایا گیا کہ ڈاک بنگلہ فوراً خالی کر دیا جائے۔ تب ہم نے نائب وزیر ترقیات سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس پر مسٹر اسداللہ میر ہمارے کمرے میں داخل ہو گئے اور ہمیں باہر صحن میں نکال لیا۔ اور زور دار الفاظ میں غیض و غضب کی باتیں کرنے لگے۔ جو دراصل مجمع کے سامنے غیر ذمہ دارانہ، اشتعال انگیز اور فرقہ وارانہ تقریر تھی۔ اس وقت ہجوم کافی بڑا جمع ہو چکا تھا۔ اور اس میں سرکاری ملازمین

زر خرید غنڈوں کے علاوہ اُن لوگوں کی خاصی تعداد تھی۔ جو آس پاس کے علاقوں سے جمعۃ الوداع کے سلسلے میں مقامی مسجد میں نماز پڑھنے کیلئے آئے تھے۔ مسٹر اسد اللہ نے ہمارے خلاف مسلمانوں کے فرقہ وارانہ جذبات کو زبردست ابھارا۔ آپ نے ہماری طرف مخاطب ہوکر مزید کہا "آج مسلمانوں کا بڑا دن ہے۔ اور آپ لوگ آج کے ہی دن مسلمانوں میں یہاں لڑائی بپا کرنے کیلئے آئے ہیں۔" میر صاحب نے بدترین قسم کی غلط بیانی سے کام لے کر متعلقہ حلقہ انتخاب اسمبلی کیلئے پرجا سوشلسٹ امیدوار شری دیوی داس ٹھاکر کے خلاف فرقہ وارانہ زہر پھیلا کر کہا کہ اس کے گھر سے اب بھی ۱۹۴۷ء میں قتل کیے گئے مسلمانوں کی کھوپڑیاں ملیں گی۔ اس اشتعال انگیز تقریر اور بہتان تراشی کے بعد حاضرین کے ہم پر لوٹ پڑنے کی خواہش تھی۔

ہم نے مختصر طور اپنی پوزیشن کی وضاحت کرنے کے بعد کہا کہ اب ہمارا خیال واپس سرینگر جانے کا ہے۔ لیکن ہمیں گاڑی نہیں ملتی ہے۔ اس پر میر صاحب (غصہ میں) بولے کہ ابھی یہاں آپ لوگوں کو تین دنوں تک گاڑی نہیں ملے گی۔ بہر حال، ہماری دوبارہ وضاحت کرنے پر اور یہ احساس دلانے کے بعد کہ ایک منسٹر کی حیثیت میں لاء اینڈ آرڈر کا وقار قایم رکھنے کی خاطر اس امر کی طرف ان کی توجہ دلائی جاتی ہے۔ اس پر انہوں نے ہمارے لئے فوراً ٹرانسپورٹ کا انتظام کرنے کا یقین دلایا اور وہ خود سامعین کو نماز پڑھنے کی تلقین کر کے وہاں سے چلے گئے۔ لیکن بہت دیر تک انتظار کرنے کے باوجود بھی ہمیں میر صاحب کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ ہمیں یقین ہوا کہ وہ بہت غیر ذمہ دارانہ طریقے سے پیش آکر ہمارے متعلق اب بھی بدستور حقیر عزایم رکھتے ہیں۔ غنڈے لاٹھیاں، چھریاں، اور کلہاڑیاں لے کر بدستور ہم پر حملہ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جس وجہ سے ہم کمرے سے باہر سڑک کی طرف جا ہی نہ سکے۔ اور بھی افسوس

کی بات یہ تھی کہ پولیس کو ہدایت دی گئی تھی کہ سرینگر یا جموں جانیوالی کوئی بھی گاڑی ہمارے لئے رکنے نہ پائے۔ عام طور پر ڈاک بنگلہ میں دو دنوں تک ٹھہرنے کی اجازت ہے۔ لیکن ہم تو اب تین دنوں سے پڑے رہے تھے۔ ان خطرناک اور دل شکن حالات کو دیکھ کر ہمارا ایک ساتھی دہشت زدہ ہوگیا اور اس پر دل کا دورہ پڑنے لگا۔ بھوکا رہنے کی وجہ سے اس کی حالت اور بھی خراب ہونے لگی۔ ڈاکٹر کا کوئی انتظام نہیں ہوسکتا تھا۔ سخت ذہنی انتشار پھیلنے لگا۔ ایک دوسرے کو ہمت دیدی اور خوشی اور سکون کے ساتھ موت سے بغلگیر ہونے کا عزم کیا اور گھبرائے ہوئے ساتھی کی ڈھارس بندھائی۔ پولیس سے ہم نے اصرار کیا کہ ہمیں گرفتار کرکے اپنی حفاظت میں لیا جائے لیکن انہوں نے ہماری ایک بھی نہ مانی۔ اس کے برعکس وہ ہمیں غنڈوں کے حوالے کرنا چاہتے تھے۔ دستار پہنے علاقہ بانہال کا ایک بزرگ نما کشمیری مسلمان چپکے سے ڈاک بنگلہ کے ہمارے کمرے میں داخل ہوگئے اور ہمارے ساتھ روا رکھے گئے سلوک پر اظہار افسوس کیا اور خواجہ محمد عمر بٹ کی طرف مخاطب ہوکر بولے کہ "آپ شیخ صاحب کے وقت کے لیڈر ہیں اور آپ کے ساتھ وحشیانہ سلوک ہوتے دیکھ کر صدمہ ہورہا ہے۔ لیکن کر بھی کیا سکتے ہیں۔ یہ تو غنڈوں کا راج ہے"

اب وقت دیر آچکا تھا اور سری نگر جانے والی گاڑیوں کا ٹریفک ختم ہو چکا تھا۔ چونکہ اس وقت بانہال سے آگے جموں سڑک کی طرف راستہ عارضی طور بند ہو چکا تھا۔ اس لئے جموں جانے والی گاڑیوں کی ایک لمبی قطار رک کر لگ گئی تھی۔ اور ڈاک بنگلے کی سڑک پر تک گاڑیاں رک گئیں۔ ایک واقف کار گاڑی بان کی بدولت ہمیں ہمارے لئے جگہ مل گئی ہماری تاک میں رکھے گئے کچھ نگہبان فوراً غنڈوں کو بلانے گئے۔ لیکن ہم خوش قسمتی سے اتنی دیر میں سری نگر کی بجائے جموں کی طرف گاڑی میں روانہ ہو گئے تھے۔ اور اس رات رام بن ڈاک بنگلہ میں قیام کیا اور اگلے دن جموں چلے گئے۔ بعد میں اس حلقہ انتخاب اسمبلی کا ہمارا بائیکاٹ کرنا پڑا۔

کشمیر میں پریس کی آزادی بھی مفقود رہا ہے۔ ریاست جموں و کشمیر کے ایک پرانے اخبار "وکیل" کی اشاعت جو یہاں اب تک بدستور جاری ہے۔ آبائی اخبار ہونے کے ناطے اس بارے میں بھی میں وزیر اعظم مسٹر بخشی غلام محمد سے کئی بار ملا تھا۔ اور ان پر واضح کیا تھا کہ "وکیل" دا

کی اشاعت کی اجازت مل کر ملکی مفاد کو زک نہیں پہنچیگا۔ لیکن بخشی صاحب کھوکھلے وعدے دیتے رہے۔ تب میں نے ان کو ایک چٹھی لکھی کہ میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سرینگر کو اخبار "وکیل" کی اجازت کے حصول کیلئے ایک ہزار روپیہ زر ضمانت کے طور پر دے رہا ہوں۔ مذکورہ چٹھی میں نے ۲۵ر اکتوبر ۱۹۵۷ء کو بخشی صاحب کے ذاتی نام پر بھیجی۔ اس میں درج تھا۔

"آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ میں نہ کوئی ٹھیکیدار ہوں نہ ملازم نہ کسی سینما کا مالک اور نہ ہی پرجا سوشلسٹ پارٹی میں آپ کا پنشن یافتہ رکن۔ میرے گذارہ کے ساتھ ہی قومی خدمت کا بہترین ذریعہ اخبار "وکیل" کی اشاعت ہے۔ جس کی اشاعت حکومت کی مہربانی سے بلا وجہ ممنوع قرار دیدی گئی ہے۔

میں آپ سے اخبار "وکیل" کی اشاعت کی اجازت حاصل کرنے کیلئے کئی بار ملا۔ لیکن آپ کھوکھلے وعدے دیتے رہے۔ حالانکہ میں نے آپ کو یقین دلایا تھا کہ اخبار "وکیل" ملکی مفاد کو زک نہیں پہنچائیگا۔

آئین اور پریس لاز کی رو سے آپ "وکیل" کی اشاعت کو روک نہیں سکتے ہیں ...... میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سرینگر کو بھی درخواست دے رہا ہوں کہ وہ مجھے بعد وصولی ایک ہزار روپیہ زر ضمانت فوری طور روزانہ انگریزی اخبار "وکیل" کی اشاعت کی اجازت دیدیں"

میں نے ۲۶ر اکتوبر ۱۹۵۷ء کو پھر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سرینگر کو اخبار کی اجازت دینے کیلئے ایک ہزار روپیہ بطور زر ضمانت کی پیشکش کرتے ہوئے ایک درخواست دیدی۔ لیکن متعلقہ حکام بالا سے بات چیت کرنے کے بعد مجھے اخبار کی اجازت سے انکار کر دیا گیا۔ اس پر میں نے ان سے پوچھا کہ مجھے کس بنا پر اخبار کی اشاعت کی اجازت نہیں دی جاتی ہے۔ میں نے یہ بھی پوچھا کہ مجھے بتایا جائے۔ کہ میں کس وطن دشمن گروہ کے زمرے میں آتا

ہوں۔ لیکن اس وقت کے ڈسٹرکٹ میجسٹریٹ شری آغا ناصر نے اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ میں مختصر جواب یہی دے سکتا ہوں کہ آپ کی درخواست منظور نہیں کی جا سکی۔

ظاہر ہے کہ حکومت کے غیر جمہوری طرز عمل سے ریاستی عوام کو شہری آزادی کے بنیادی حقوق سے محروم رکھا گیا تھا۔ اور حکومت نے پریس کے ساتھ جابرانہ رویہ روا رکھا تھا۔ آئین میں محض بنیادی حقوق کے اندراج سے ہی جمہوریت کو تقویت نہیں مل سکتی۔ جب تک نہ کہ حکومت خود جمہوری روایات قائم کرنے میں دلچسپی لے لے۔ اس بارے میں میرا جو بیان بعد میں اخبارات میں چھپا تھا۔ اس میں اس بات کی صراحت میں نے کی تھی۔

"آئین میں محض بنیادی حقوق کا اندراج کرنا ہی جمہوریت کو فروغ دینے کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ جمہوری نظام صرف اس صورت میں مفید اور موثر ثابت ہو سکتا ہے اگر حکومت آئین پر کاربند رہ کر جمہوری اداروں کا تحفظ کرنے میں دلچسپی لے۔ صرف اسی سے جمہوری عناصر کی نشوونما ہو کر بالآخر ایک فلاحی سٹیٹ کے قیام میں مدد مل سکتی ہے۔ لیکن پریس کے تئیں ریاستی حکومت کی طرف سے برتی گئی سرد مہری اور جابرانہ رویہ، جس سے پریس کی آزادی مفقود ہو گئی ہے۔ جہاں نہایت ہی قابل افسوس ہے وہاں سخت ہی قابل مذمت بھی ہے۔

ریاستی اخبارات کی ایسی بُری حالت مہاراجہ کے دورِ حکومت میں بھی نہیں ہوتی تھی۔ جو کہ "عوامی راج" کے آغاز سے ہوئی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ریاستی حکومت آمرانہ طریقے پر کار فرما ہے۔ اور ریاست میں جمہوریت محض ایک فریب اور ڈھونگ ہے........ ان تمام باتوں سے یہی ظاہر ہو جاتا ہے کہ ریاستی حکومت کس غیر جمہوری طریقے پر کار فرما ہے۔ اور یہ بھی کہ ریاستی عوام کو کس طرح شہری آزادی کے بنیادی حقوق سے

محروم رکھا گیا ہے"

ریاست میں صحت مند اور تعمیری نکتہ چینی کرنے والے پریس کو ابھرنے کا موقع نہیں دیا جاتا ہے۔ بلکہ ایک پردہ آہنی پھیلایا گیا ہے۔ میرے لئے کوئی چارہ نہیں رہا کہ میں ریاستی آمریت پر اپنے جائز حقوق لڑے بغیر قربان نہ کروں تاکہ باقی شہریوں کی حوصلہ شکنی ہو کر یہ حق تلفی ان کے لئے ایک مثال نہ بن جائے۔ بلکہ میری جدوجہد ان کیلئے مستقبل میں مشعل راہ بنے اس لئے میں نے جموں جاکر ہائیکورٹ میں ریاستی حکومت کے خلاف اخبار کی اجازت حاصل کرنے کیلئے ایک رٹ پٹیشن دائر کیا۔ جو کہ اپنی نوعیت کا یہاں پہلا رٹ پٹیشن تھا۔ جس کی تردید میں حکومت کی طرف سے ہائیکورٹ میں یہ بیان دیدیا گیا کہ میں اخبار کی اجازت حاصل کرنے کیلئے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سرینگر کے پاس کبھی گیا ہی نہیں ہوں۔ اس بارے میں سرکار نے جو فائلیں ہائیکورٹ میں پیش کیں۔ ان میں میری متعدد درخواستیں تار اور رجسٹریاں ایسے غائب تھیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ بہر حال مجھے ہدایت ہوئی کہ میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پاس جاؤں۔ اور ڈکلیریشن بھر کر تصدیق کراؤں۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب اب حالات کی مجبوری کے باعث بالکل ہی روٹھ گئے۔ جب کبھی ان کے دفتر جاتا تو شرف ملاقات ملے بغیر اندر سے پیغام آتا کہ وہ ابھی فوراً کسی ضروری کام سے باہر جارہے ہیں۔ اس لئے اور کسی دن آجاؤں۔ ٹیلیفون کرتا تو یہی جواب ملتا کہ بس باہر جارہے ہیں اور کسی دن آجاؤں۔ اور ملنے کیلئے اگلا دن اور وقت یا تو ایسا ہوتا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب وہاں ہوتے ہی نہیں یا اگر ہوتے تو وہی پرانا ریکارڈ دوہرایا جاتا۔ میرے ایڈوکیٹ دوست شری رام ناتھ بھلگوترہ کو بھی یہی جواب ملا۔ ایک ملازم سرکار ہونے کے ناطے مجھے شری آغا ناصر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سری نگر کی مجبوریوں کا احساس تھا۔ شروع میں تو وہ خندہ پیشانی سے مل جانے بلکہ رازدارانہ

لہجے میں ایک دن مجھے بتایا تھا کہ اخبار کی اجازت مشکل ہے۔ درجنوں درخواستیں ردی کی ٹوکری میں پڑی ہیں۔ اسی بناء پر میں نے رٹ پٹیشن دائر کرنے سے پہلے متذکرہ بالا اخباری بیان سرکار کے خلاف دیا تھا۔ اس کے بعد آغا صاحب مجھے دفتر میں ملے۔ اور گلہ کیا کہ "میں نے دوستانہ ماحول میں وہ بات بتائی تھی۔ جس کو استعمال کر کے آپ نے میرے خلاف بیان دیدیا" اس کے بعد رٹ دائر کرنے کی نوبت آئی جس کا حشر سطور بالا میں درج ہے کشمیر کے حالات پر تبصرہ کرنے کے دوران یہ باتیں میں نے جبلپور کے مشہور بیرسٹر اور اس وقت کے ممبر پارلیمنٹ شری یو۔ ایم۔ ترویدی کو بھی سنائیں انہوں نے تو پہلے ان باتوں کی صداقت پر اعتبار ہی نہیں کیا۔ اور کہا۔ کہ حکومت اتنی کمینہ اور بزدل نہیں بن سکتی اور جب اطمینان ہوا۔ تو تعجب کا اظہار کرنے لگے۔ ترویدی صاحب کو زبانیں سیکھنے کا بڑا شوق ہے۔ کشمیری سیکھنا بھی چاہتے تھے۔ اس لئے مجھے میرے دادا صاحب مرحوم پنڈت سالگرام کول وکیل کی لکھی ہوئی "کشمیری ریڈر" کتاب کو بطور تحفہ قبول کیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ کشمیر کی بہادر سرکار کے بہادر کارناموں سے آگاہی بھی حاصل کی۔

اسی دوران ریاست کے مشہور جرنلسٹ لالہ ملک راج صراف سرینگر سے ایک تجارتی جریدہ نکالنا چاہتے تھے۔ جس کی اجازت حاصل کرنے کیلئے وہ بخشی صاحب سے کئی بار ملے تھے۔ لیکن تاخیر ہونے کی وجہ سے وہ پھر اس بارے میں بخشی صاحب سے ملے۔ اور ان سے پوچھا کہ کہیں آپ (بخشی صاحب) مجھ کو (صراف صاحب کو) بھی کول برادران کی طرح مت ٹال رہے ہیں۔ اس پر کشمیر کے وزیر اعظم نے فخر کے ساتھ صراف صاحب کو جواب دیا کہ آپ کو اخبار کی اجازت ملے گی لیکن ان کو نہیں ملے گی چاہے وہ ہائیکورٹ چھوڑ کر کہیں اور بھی جائیں۔ ایک بار تو بخشی صاحب نے مجھے اخبار کی اجازت دینے میں رضامندی ظاہر کی تھی۔ اور مجھے پرجا سوشلسٹ

پارٹی کو چھوڑ کر نیشنل کانفرنس میں شامل ہونے کی دعوت بھی دی تھی۔ اور نیشنل کانفرنس میں میری ہر ممکن حوصلہ افزائی کر کے مجھے آگے بڑھانے کا یقین بھی دلایا تھا۔ اس امر کے باوجود بھی کہ یہاں پرجا سوشلسٹ پارٹی کا وجود محض برائے نام تھا۔ میں نے بخشی صاحب کی دعوت کو قبول کرنے میں نارضامندی ظاہر کی اس پر بخشی صاحب نے بھانپ لیا کہ میں کسی لالچ یا جھانسے میں آنے والا نہیں ہوں تب انہوں نے چالاکی سے ٹال کر مجھے اگلی بار ملنے کو کہا۔ تاکہ اس دن اخبار کی اشاعت کیلئے اجازت دی جا سکے۔ میں جان گیا کہ بخشی صاحب کی دعوت کو ٹھکرا کر انہوں نے مجھے ٹال دینے کا بہانہ بنایا۔ اس لئے میں نے کہا کہ آپ سے انٹرویو ملنا بہت مشکل ہے۔ اس لئے آج ہی قطعی جواب دیا جائے۔ اس پر بخشی صاحب نے جواب دیا کہ وہ آج کل اسمبلی کے کام میں بہت مصروف ہیں۔ اور دس پندرہ دنوں کے بعد وہ ضرور ملیں گے اور اخبار کی اجازت دینگے بغیر اس انٹرویو کے بغیر۔ مجھے وزیر اعظم سے ملاقات نہیں مل سکی۔ ایک دفعہ تو میں نے بخشی صاحب کے پرائیویٹ سیکریٹری شری آر۔ سی۔ رینہ اور سپیشل ڈیوٹی پر مامور افسر شری روگناتھ وار یکو کے سامنے انٹرویو نہ ملنے پر بخشی صاحب اور ان کے خلاف زبردست غصہ ظاہر کیا۔ اس پر شری وار یکو نے کہا کہ وہ خود مجھے کچھ دنوں تک انٹرویو کی اطلاع گھر بھجوا دیں گے۔ اور یہ اطلاع مجھے کبھی ملی نہیں۔ جس پر میں نے متذکرہ صدر چٹھی بخشی صاحب کو لکھی تھی۔ وزیر اعظم کشمیر اس پر بہت برافروختہ ہوئے۔ اور کہا کہ میں ایک غنڈہ ہوں۔ اور میں نے بخشی صاحب کی ذات اور ان کے بھائیوں پر حملہ کیا ہے۔ اور یہ اظہار کیا کہ انہوں نے شیخ عبداللہ جیسے آدمی تک کو نہیں چھوڑا۔ تو مجھے کہاں اپنی زد سے بچنے دیں گے۔ بخشی صاحب نے کشمیر پرجا سوشلسٹ پارٹی کے لیڈر خواجہ محمد عمر بٹ کو بلا کر میرے خلاف غصہ چھانٹ لیا۔ اگرچہ خواجہ صاحب مرحوم میرے بڑے قدردان تھے۔ لیکن اس دوران ان سے اختلاف ہونے کے باعث میں ان کے پاس نہیں جاتا تھا۔ اس لئے خواجہ صاحب نے کچھ

پارٹی ساتھیوں کو میری اس بے باکانہ حرکت اور بخشی صاحب کے غیض و غضب سے آگاہ کیا۔ اور مجھے بلالانا چاہا۔ موضع بچھرو کے پارٹی ساتھی خواجہ غلام قادر بابا (جو آج کل کانگریس کے رکن ہیں) اور دیگر اراکین میری اس حرکت رندانہ کی تفاصیل جاننے کیلئے مجھے ڈھونڈتے رہے۔ اور بٹ صاحب سے ملنے کا پیغام دینا چاہتے تھے۔ میرے ایک رشتہ دار اور لیجسلیٹو کونسل کے چیرمین شری شیو نرائین فوطیدار بھی گھر آئے۔ اور میری بخشی صاحب کے نام انتباہ آمیز چٹھی کے بارے میں پوچھنے لگے اور میری سرکشی کو دبانے کیلئے نصیحت کرنا چاہتی تھی۔ لیکن میری سرکشی ہمت اور استقلال میں کبھی لغزش نہیں آئی۔

اس کے بعد میں دہلی چلا گیا۔ اور دہلی یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ میں نے بہادر کی اعانت سے ہفتہ وار انگریزی اخبار "وکیل" کا اجراء دہلی سے کیا۔ جس کے ذریعے سے کشمیر کے حالات کا بیباکی کے ساتھ پوسٹ مارٹم کیا۔ اخبار شائع ہونے سے پہلے بخشی صاحب مجھے دہلی کے کانسٹیچوشن کلب میں منعقدہ ایک جلسہ کے بعد ملے۔ بہت سے آدمیوں اور معتقدوں سے گھرے ہوئے بخشی صاحب بڑے پیار اور قدر سے پیش آئے۔ جیسے ان کے اور میرے درمیان کوئی تناؤ تھا ہی نہیں۔ یہ دیکھ کر جموں کے یوتھ کانگریس لیڈر شری اوم ملہوترہ (وہ بھی اُن دنوں دہلی میں قانون کے طالبعلم تھے اور بعد میں پرجا سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے تھے۔) اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ میں بخشی صاحب کے خاص الخاص آدمیوں میں ہوں۔ بخشی صاحب نے مجھے نئی دہلی کے آرٹس ایمپوریم پر اگلے دن ملنے کو کہا۔ میں ان سے حسب وعدہ ملا۔ بخشی صاحب خندہ پیشانی اور پیار کے ساتھ پیش آئے۔ اور مجھے بہت اصرار کیا کہ میں دہلی سے اخبار نہ نکالوں۔ بلکہ میں فوراً کشمیر واپس آؤں۔ اور وہاں سے اخبار نکالوں۔ اور میری ہر ممکن امداد کی جائے گی۔ لیکن

میں بخشی صاحب کی اس کرمفرمائی کا فائدہ نہ اٹھا سکا۔ اور انکار کیا۔ دہلی میں اخبار کیسے اور کن حالات میں نکالا اور گرفتاری کے امکانات اور دیگر واقعات کا تذکرہ یہاں کرنا مناسب نہیں ہے۔ یہ بھی بجائے خود کشمیر کی جدوجہد آزادی صحافت کی تاریخ کا ایک نمایاں باب ہے۔ جس کا بیان میں کسی دوسری کتاب میں کروں گا۔

کشمیر میں سیاسی حریفوں کو غنڈہ گردی سے دبانے کیلئے ایڈیشنل پولیس اور پیس برگیڈ قائم تھے۔ پیس برگیڈ کو سپیشل پولیس میں تبدیل کیا گیا تھا اگر کہیں کوئی مخالف میٹنگ ہوتی تو اسی پیس برگیڈ کے بلا وردی ملازم اپنی ہلڑبازی کے کرتب دکھاتے۔ صادق وزارت میں اس بدنام ادارہ کو ختم کر کے "ہوم گارڈ" نامی ادارہ اس کے بدلے قائم کیا گیا۔ پندراں سالوں سے میونسپل کمیٹیوں کے انتخابات نہیں ہوئے ہیں۔ اور ان اداروں کے حکام چھوٹے درجے کے اچھے خاصے مطلق العنان حاکم بن بیٹھے ہیں۔

سیاسی جلسے جلوسوں پر تو عام طور پابندی لگی رہتی تھی۔ صادق وزارت نے بھی یہ روش قائم رکھی۔

"صادق صاحب اپوزیشن میں تھے تو جمہوریت اور شہری آزادیوں کے علمبردار ہونے کا دعویٰ کیا کرتے تھے۔ اب حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں ہے تو جمہوریت اور شہری آزادیوں کا خون کر رہے ہیں۔ ان کے راج میں اخباروں پر پابندیاں لگی ہوئی ہیں یہ پابندیاں ان اخباروں پر عائد نہیں۔ جو مرکزی سرکار اور مرکزی لیڈروں کو گالیاں دیتے ہیں۔ پابندی ان اخباروں پر لگی ہے۔ جو صادق سرکار کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ ....

.... اب پرجا سوشلسٹ پارٹی نے شکایت کی ہے کہ اس نے سرینگر کے ایک حصہ میں جلسہ منعقد کرنے کی اجازت

طلب کی تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے انکار کر دیا۔ حیرانی ہے کہ دہلی میں تو شریمتی اندرا گاندھی کی سرکار مہنگائی کے خلاف ایک لاکھ کمیونسٹوں کے مظاہرے پر کوئی پابندی نہیں لگاتی۔ مگر جمہوریت اور شہری آزادی کی علمبرداری کرنے والی صادق سرکار کشمیر میں پرجا سوشلسٹ پارٹی کو مہنگائی کے خلاف احتجاجی جلسہ منعقد کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ شاید صادق صاحب اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ کہ ان ہتھکنڈوں کے ذریعہ وہ جنتا کی آواز دبا سکیں گے۔ یا کشمیر سے باہر کے لوگوں کو کشمیر کے صحیح حالات سے بے خبر رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے"۔ [1]

شہری آزادی تو چھوڑ شہریوں کو اپنی زندگی کی ضمانت بھی صادق وزارت میں نہیں مل سکی۔ حکومت کی سختی اور بے بسی کے سامنے لوگوں کی ایک بھی نہ چلی۔ وہ فریاد کرتے تو شنوائی نہیں ہوتی۔ وہ احتجاج کرتے تو گلا دبا جاتا۔ وہ گھٹ گھٹ کر آنسو بہاتے اور کرب سے چیخ اٹھتے تو حکومت سنی کو ان سنی کرتی۔ سرکاری تشدد اور بربریت سے فرار یا اس کے خلاف یلغار کا اور کونسا معصومانہ طریقہ ہوتا؟ پھول سے کئی کملا گئے۔ کئی بیدردی سے روندے گئے۔ اور پولیس کی گولیوں اور لاٹھیوں سے کئی نوجوان موت کی گھاٹ اتر گئے۔

"یہاں پر یہ بتانا ممکن نہیں ہے۔ کہ گزشتہ چار پانچ برسوں کے دوران ہمارے کتنے نوجوان اور طلباء پولیس کی گولیوں اور لاٹھیوں سے جاں بحق ہوئے ....

سینکڑوں نوجوان اور طلباء شاہد طور اس بربریت کے دوران زخمی

---

[1] اخبار "سویرا" دہلی۔ مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۶۶ء

ہوئے۔ پولیس کی لاٹھی کا سخت وحشیانہ استعمال اس طرح کیا جاتا ہے کہ لاٹھی کا نشانہ مظلوم کا سر بنے تاکہ وہ ہلاک ہو جائے اور اس طریقہ سے بہت ساری جانیں ضایع ہوئیں۔ ایس۔ پی۔ کالج کے ایک جواں سال طالب علم دلیپ کمار نہرو کی ہی مثال لیجئے جو اس خونی کھیل کا نشانہ بنا۔ کچھ دن پہلے مسلح پولیس نے کالج پر حملہ بول دیا اور کالج کے کمروں میں گھس کر آزادانہ طور بیگناہ طلباء پر لاٹھیاں برسائیں۔ دلیپ کمار کے سر پہ تین مہلک زخم لگے۔ اور وہ جان بحق ہوا۔ اس کی عمر ۱۴ سال تھی۔ وہ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔

چیف منسٹر کی ستم ظریفی کو کیا کہا جائے کہ اس نے سٹیٹ اسمبلی میں اس کی موت کی وجہ بتائی کہ 'دلیپ کمار ایک صدمہ سے مر گیا،' اس سے تو اس نے اپنے بے لگام پولیس کی وحشیانہ کاروائی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ اندھا دھند خونریزیوں کی لاتعداد مثالوں میں سے یہ ایک مثال ہے"۵

جموں میں تو پہلے ہی طلباء کے خون سے ہولی کھیلی گئی تھی۔ پولیس کی گولیاں کالج کے کمروں میں بھی داخل ہو گئیں۔ ۱۷ اور ۱۸ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو جموں شہر پولیس کی دہشت سے ماتم سرا میں بدل گیا تھا۔ پانچ طالب علم پولیس کی اندھا دھند گولیوں سے بے رحمی کے ساتھ موت کی نیند سلا دئیے گئے۔

"جموں کے شہریوں اور طلباء پر کیا گذری۔ اس کا اندازہ اسی بات سے کیا جا سکتا ہے کہ سارے شہر میں پانچ دن تک ہڑتال جاری رہی۔ صادق صاحب اور ان کے دوسرے

---

۵ شیر کشمیر کا خط شری وائی۔ بی۔ چوہان وزیر داخلہ ہند کے نام

ساتھیوں نے سر توڑ کوششیں کیں کہ یہ کھل جائے۔ لیکن مشتعل اور مجروح جنتا نے ان کی ایک نہ سنی۔ اس کے بعد جموں و کشمیر کے گورنر شری کرن سنگھ کو مداخلت کرنا پڑی اور تب جا کر لوگوں نے کاروبار جاری کرنا سویکار کیا"۔[۵]

---

[۵] اخبار "پرتاپ" نئی دہلی مورخہ ۲۶ر اکتوبر ۱۹۶۸ء

انتخابات کا ڈھونگ

۱۹۴۷ء کے بعد ریاست جموں و کشمیر میں جب جب بھی اور جو جو بھی چناو ہوئے۔ وہ عام طور غیر جانبدارانہ طریقے سے اور آزادانہ ماحول میں نہیں ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں آئین ساز اسمبلی کے انتخابات کے دوران چند ایک نے ہی انتخاب لڑنے کی جسارت کی تھی۔ ۱۹۵۷ء میں ریاستی اسمبلی کے جو انتخابات ہوتے۔ اس کا علیحدہ پسند جماعتوں نے وادی کشمیر میں بائیکاٹ کیا۔ کچھ نشستوں پر نیشنل کانفرنس کے امیدواروں کے خلاف پرجا سوشلسٹ پارٹی اور چند آزاد امیدواروں نے کاغذات نامزدگی داخل کرلئے۔ ان میں اکثر امیدواروں کے فارم ہائے نامزدگی جانچ پڑتال کے دن مسترد کرائے گئے۔ وادی میں باراں پرجا سوشلسٹ امیدواروں میں سے نو (۹) امیدواروں کے کاغذات نامزدگی مسترد کیے گئے۔ ان حالات کو دیکھ کر پارٹی کا نوجوان حلقہ احتجاج کرنے پر آمادہ ہوا اور انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کی ٹھان لی۔ اس کی اطلاع پرجا سوشلسٹ پارٹی کے مرکزی دفتر نئی دہلی اور ریاستی پرجا سوشلسٹ پارٹی کے چیرمین شری اوم پرکاش صراف کو جموں دیدی۔ صراف صاحب نے اس کی بنیاد پر ایک اخباری بیان میں پارٹی کے بائیکاٹ کرنے کا امکان ظاہر کیا لیکن اُس وقت کے ریاستی پارٹی کے سیکرٹری خواجہ محمد عمر بٹ نے بائیکاٹ کی خبر کو محض افواہ قرار دیا۔ یہ خبر ریڈیو کشمیر سے خصوصی طور پر نشر ہوئی۔

اس پر پارٹی میں تناد پیدا ہوگیا۔

خواجہ غلام محمد صادق۔ شری ڈی، پی، در۔ اور شری شیام لال صراف

کے خلاف انتخابی عذر داریاں داخل ہوئیں۔ خواجہ صادق کے مخالف پرجا سوشلسٹ امیدوار شری دوارکا ناتھ جلالی اور شری ڈی، پی، در کے پرجا سوشلسٹ مد مخالف شری محی الدین قاضی تھے۔ اور پنڈت شیام لال صراف کے خلاف عذر دار میں تھا۔ بخشی گروپ اور صادق گروپ کی اندرونی رسہ کشی کی بناء پر صادق صاحب اور ڈی، پی، صاحب کی انتخابی عذر داریوں میں بخشی گروپ نے خاصی دلچسپی لے لی۔ چونکہ پنڈت شیام لال صراف صادق گروپ سے ناطہ توڑ کے فوراً ہی دوبارہ بخشی صاحب کی پناہ میں آئے۔ اس لئے ان کے خلاف انتخابی عذر داری کو طرح طرح کے طریقے استعمال کرکے واپس لے جانے اور ختم کرانے کی کوشش کی گئی۔ یہاں تک کہ باقی پرجا سوشلسٹ عذر داروں کی پیروی برابر دلچسپی سے ہوتی رہی۔ لیکن میری عذر داری کو وکیل کی پیروی سے بھی محروم کیا گیا۔ مرحوم خواجہ مختار عمر بٹ بخشی صاحب کے آلہ کار بن گئے تھے۔ اس لئے مجھے پارٹی کے اندر اور باہر ختم کرنے کی ناکام کوششیں ہوتی رہیں۔ ادھر صادق گروپ کے سرکردہ رکن اور سابق اسمبلی کے سپیکر شری غلام رسول رینزو اسمبلی کا انتخاب ایک آزاد امیدوار شری عبدالرحمان غازی سے بخشی گروپ کی درپردہ مخالفت کی وجہ سے ہار گئے تھے۔ اور ادھر انتخابی عذر داریوں کا دباؤ ڈال کر صادق صاحب اور ڈی، پی، صاحب کو بخشی صاحب کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کی کوشش میں رہے صادق گروپ مجبور ہوکر نیشنل کانفرنس سے علیحدہ ہوا۔ اور ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کو تشکیل دیدی۔

میں نے صادق صاحب کے خلاف عذر دار شری جلالی کو تھپکی دیدی اور ان کا حوصلہ بڑھا کر مشورہ دیا کہ وہ صادق صاحب کی حمایت کریں۔ میرا مدعا شہری آزادی اور جمہوری بقا کیلئے اپنا مقدور بھر حصہ ادا کرنے کا تھا۔ جلالی صاحب نے ایسا ہی کیا۔ اور خواجہ صادق نے بڑی خوشی سے اس اقدام کو

لبیک کیا۔ بلکہ صادق صاحب نے خوشنودی کے طور پر اور اس کے عوض ہی مالی لحاظ سے بھی جلالی صاحب کی خدمت کی۔ خواجہ صادق نے جلالی صاحب کو پہلے انڈر گراؤنڈ کرا دیا اور اس کے بعد دہلی لے گئے۔ بخشی صاحب کے دست راست پولیس افسر مسٹر شیخ غلام قادر گاندربلی جلالی صاحب کی کھوج نکالنے میں لگ گئے۔ اور ان کے کچھ رشتہ داروں کو ہراساں کیا لیکن بے سود۔ خواجہ عمر بٹ نے ریاستی انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر مہرہ اور پرائم منسٹر کو یہ درخواست دیدی کہ مسٹر جلالی کو اغوا کیا گیا ہے۔ ان کے جان کی حفاظت کی جائے۔ منشا یہ تھا کہ اسی بہانہ جلالی صاحب کو صادق گروپ سے علیحدہ کیا جائے۔ مسٹر جلالی شری پیارے لال ہنڈو کی حفاظت میں مسٹر مہرہ سے ملے۔ اور انہیں یقین دلایا کہ ان کو اغوا کئے جانے کی درخواست لغو اور بے بنیاد ہے۔ اور کہ وہ بالکل آزاد اور خوش ہیں۔ چنانچہ پولیس انسپکٹر جنرل کے ہاں سے مسٹر جلالی نے خواجہ عمر بٹ کو ٹیلیفون پر اطلاع دیدی کہ وہ اغوا نہیں کئے گئے ہیں۔ بلکہ آزاد ہیں۔ اس پر بخشی گروپ میں ہیجان پھیل گیا۔ صادق گروپ کیساتھ مل جانے کے بعد شری جلالی نے خواجہ عمر بٹ کو جو احتجاجی چٹھی لکھی اس میں درج تھا کہ

"دوسرے آدمیوں کے ذاتی مفادات کی پرورش کرنے کے لئے ہمارے ساتھ سلوک ایک سوتیلی ماں کا جیسا روا رکھا گیا۔ ...... یہاں تک کہ پولیس بھی، جو ایک خالص انتظامیہ ایجنسی ہے۔ مجھے اس سیاسی بلیک میلنگ کا آلہ کار بنانے کے لئے خوفزدہ اور مجبور کرانے میں پیچھے نہیں رہی۔ ...... یہ سب کچھ آپ کی سوچی سمجھی چال اور رہنمائی میں ہوا"

میری غداری کی پیروی میں ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس نے دلچسپی لی۔ اور بعد میں اس کی پیروی کی تمام تر ذمہ داریاں اس وقت کی پرجا پریشد کے جنرل سیکرٹری شری رام ناتھ بھلگوترہ ایڈوکیٹ نے سنبھال لیں۔

ساری غذر داریاں ناکام ہوئیں لیکن میری عذر داری کی اپیل ہائیکورٹ میں ہو گئی۔ بخشی گروپ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں اپیل منظور نہ ہو جائے۔ اس بناء پر میرے اور میرے بھائی کے ساتھ صلح وصفائی کی باتیں ہونے لگیں لیکن میں اپنے سود و زیان سے بے نیاز ہو کر اپنی سیاسی ضد پہ قایم رہا۔ چنانچہ ایک شام کو نیشنل کانفرنس کے جنرل سیکرٹری شری بخشی عبدالرشید، میرے رشتہ دار اور لیجلیٹو کونسل کے چیرمین شری شیو نرائن فوطیدار اور شری جانکی ناتھ بھٹ ایڈوکیٹ (جو بعد میں جج ہائیکورٹ بنے) ہمارے غریب خانہ پر تشریف لے آئے اور مجھے اور میرے بھائی شری پوشکر ناتھ وکیل کو مخالفت ترک کر کے اور تعاون دے کر آگے بڑھنے کا مشورہ دے دیا اور صراف صاحب کے خلاف اپیل واپس لینے کی التجا کی۔ چونکہ کوئی قدم اٹھا کے میں پیچھے ہٹنے والا یا جھکنے والا نہیں ہوں۔ اور میں اپنی سیاسی پختہ ارادی اور مستقل مزاجی پر ادھار کھائے بیٹھتا ہوں۔ اس لئے میں لالچ یا رعب سے بالاتر ہو کر انتہائی کٹھن آزمائشوں میں اپنے آپ کو ڈالتا ہوں۔ ورنہ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ اپیل جیتنے کے باوجود بھی مجھے کچھ ملنے والا نہیں ہے۔ تب بھی میں اپنے قول و فعل پر بہت کچھ نقصان اور مصائب اٹھانے کے باوجود بھی ثابت قدمی سے ڈٹا رہا۔ بحث کے دوران شری بخشی عبدالرشید ہائیکورٹ پر آئے اور مجھے اور میرے بھائی شری پوشکر ناتھ کول وکیل کو دیر تک پھر منوانے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن میں اپنی ہار کو اس سودابازی پر ترجیح دے بیٹھا تھا۔ اس لئے میں انکار کرنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکا۔ میرے بھائی صاحب ان دنوں ایک ٹریڈ یونین لیڈر تھے۔ خیر اس پر نیشنل کانفرنس کے ایک سرگرم رکن شری غلام قادر میرے ایڈوکیٹ شری رام ناتھ بھلگوترہ کے پاس گئے اور انہیں کہا کہ وہ چلے جائیں کیونکہ ہم نے رشید صاحب کے ساتھ تصفیہ کر لیا۔ وہ مایوس ہو کر کتابیں سمیٹنے لگے لیکن میں اور میرے بھائی صاحب فوراً پہنچے اور ان کو بتا دیا کہ تصفیہ کی بات بالکل غلط ہے۔ بحث کر لیجئے۔ اس پر وہ حیران ہو گئے اور میری ہمت اور اصول پرستی کی داد دیدی۔ انہوں نے کہا کہ میں نے

کشمیری پنڈتوں میں سے قربانی ، اعلیٰ کردار ، بلند ہمتی ، نڈرتا اور اصول پرستی کا ثبوت بہم پہنچایا۔ انہوں نے مزید یہ کہا کہ یہ سمندر میں رہ کر مگرمچھ سے بیر رکھنے والی بات ہے۔ اسلئے میری بے باکی اور قربانی انہوں نے ذاتی مشاہدہ کی بناء پر قابل تعریف قرار دیدی۔ بہرحال اپیل نامنظور ہوئی۔ اور بعد میں سپریم کورٹ میں اپیل کرنے کی اجازت بھی نہ دی گئی۔ اس کے بعد میں اخبار نکالنے اور قانون کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے دہلی چلا گیا۔ صادق گروپ سنہ ۱۹۶۰ء میں واپس نیشنل کانفرنس میں چلا گیا۔

کشمیر میں ایسی سختی اور پردہ آہنی تھا کہ انتخاب لڑنے کیلئے مخالف امیدوار کو کوئی تجویز کنندہ آگے آنے کی جرات نہیں کرتا تھا۔ کوئی ووٹر اگر مخالف امیدوار کو تجویز کر بھی لیتا تو اس کو جانچ پڑتال سے پہلے ہی اغوا کرلیا جاتا۔ سنہ ۱۹۶۲ء کے الیکشن میں پھر وہی بے ضابطگیاں اور سختیاں دوہرائی گئیں حلقہ انتخاب اسمبلی دیوہ سر کیلئے پرجا سوشلسٹ امیدوار شری عبدالرحمان بٹ کے ساتھ کیا بیتی اور کس طرح سے اس کو انتخاب لڑنے سے باز رکھا گیا۔ اس کی تفصیل بھی اس علاقے کے ایک سابق پرجا سوشلسٹ کارکن شری عبدالسلام کی زبانی سنئے :-

"فارم بھرنے کا آخری دن ۳ فروری سنہ ۱۹۶۲ء آیا تو بٹ صاحب موصوف لوگوں کے ایک جم غفیر کے ساتھ جلوس کی صورت میں کولگام بوقت ساڑھے دس بجے پہنچ گئے۔ جہاں پر کہ ریٹرننگ افسر صاحب کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ اس روز کولگام کی کیا حالت تھی اور نیشنل کانفرنس والوں نے کون سے ناپاک حربے استعمال کئے اس پر جمہوریت آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ریٹرننگ افسر اور منصف مجسٹریٹ صاحب دفتر میں تھے ہی نہیں۔ تار۔ ٹیلیفون ہمارے لئے منقطع اور بس سروس بند۔ قدم قدم پر پیس بریگیڈ، سی آئی، ڈی، نیشنل کانفرنس کے تنخواہ داروں، روٹ پرمٹ والوں اور

ٹھیکیداروں کی پربار۔ راقم بحیثیت تجویز کنندہ ساتھ تھا۔ اس لئے آنکھوں دیکھا حال درج کر رہا ہوں تاکہ دنیا یہ جان سکے کہ نیشنل کانفرنس اور کشمیر اسمبلی کو عوام کا کتنا اعتماد حاصل ہے۔
...... ریٹرننگ افسر کی بابت دریافت کیا تو دفتر والوں نے کہا کہ وہ یہاں نہیں ہیں۔ حالانکہ وہ ڈیرے پر نیشنل کانفرنسی ممبروں کے ساتھ مخالف ممبروں کو ناکام بنانے کے منصوبے بنا رہے تھے۔

ہم ریٹرننگ افسر کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے ...... اور انچارج سے زر ڈیپازٹ لینے کا اصرار کیا۔ انہوں نے کہا کہ ٹریجری افسر (جو کہ ریٹرننگ افسر بھی تھے) یہاں نہیں ہیں اور میں زر ڈیپازٹ بھی نہیں لے سکوں گا۔ آپ اور کسی بنک... میں رقم جمع کرا سکتے ہیں۔ تو ہم نے کام کو آسان بنانے کی غرض سے رقم بنک میں جمع کرائی۔ اس کے بعد محکمہ ڈاک و تار سے چار دفعہ تار، ٹیلیفون کرنے کا اصرار کیا تو جواب ملا کہ تار بھی منقطع ہے، اور ٹیلیفون بھی۔ حالانکہ نیشنل کانفرنس والوں کیلئے تار و ٹیلیفون بالکل کھلا تھا۔

بوقت اڑھائی بجے ریٹرننگ افسر صاحب دفتر پر آ گئے۔ ہم نے فارم پیش کیا تو کہا کہ زر ڈیپازٹ نقدی لے آؤ۔ ہم بنک سے رقم واپس لانے کیلئے گئے۔ جونہی ہم اور ہمارا امیدوار بنک پر پہونچ گئے۔ تو ہم پر نیشنل کانفرنسیوں اور سرکاری ملازموں نے حملہ بول دیا۔ اور مار پیٹ وغیرہ شروع کی۔ راقم تحصیلدار کے پاس امن بحالی کیلئے گیا۔ تحصیلدار موصوف جو کہ ریٹرننگ افسر بھی تھے نے کہا کہ امن خود بخود قائم ہوگا۔ تحصیلدار صاحب نے پھر مستی کی حالت میں سب انسپکٹر پولیس کو امن بحالی کا زبانی حکم دیا۔ سب انسپکٹر صاحب نے لیت و لعل سے کام لے کر

ہمارے ہی امیدوار کو حراست میں لے لیا۔ تو راقم نے بحیثیت تجویز کنندہ ریٹرننگ افسر کی خدمت میں فارم اور نقدی اڑھائی سو روپیہ پیش کیے۔ اس وقت تین بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ ریٹرننگ افسر نیشنل کانفرنسی امیدواروں کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ راقم اصرار پہ اصرار کرتا رہا۔ کہ ہمارے نامزدگی کے فارم کی طرف توجہ دی جائے۔ لیکن وہ ٹالتے رہے۔ یہاں تک کہ تین بج کر ایک منٹ ہوا۔ تو راقم نے پھر عرض کی اور جواب ملا۔ کہ ٹائم ختم ہوا۔ وہ یہ کہہ ہی رہے تھے کہ نیشنل کانفرنس والوں نے راقم پر دوبارہ حملہ بول دیا۔ اور راقم سے نقدی اڑھائی سو روپیہ اور فونٹین پن چھین لیے گئے۔ اور راقم کو زدوکوب کیا گیا اور بٹ صاحب سے حراست کے دوران ایک گلوبند چھین لیا گیا۔ بٹ صاحب زیر حراست ہی تھے کہ راقم سوشلسٹ متحدہ محاذ کے لیڈروں، شری اوم پرکاش صراف پرجا سوشلسٹ، سردار سنت سنگھ تیغ اکالی دل اور شری پیارے لال کول پرجا سوشلسٹ و دیگر ساتھیوں کو یہ کہانی سنانے کیلئے سری نگر چلا گیا۔ پرجا سوشلسٹ لیڈروں نے راقم سے تحریری بیان لیا......

ہم حیران ہیں کہ آزاد ہندوستان کی اس ریاست میں ایک ہندوستانی پارٹی کے بے لوث اراکین کے خلاف کیوں ایسے غیر جمہوری اور غیر آئینی ہتھکنڈے استعمال کیے جا رہے ہیں۔

ہم حکومت ہندوستان اور چیف الیکشن کمشنر سے پرزور استدعا کرتے ہیں کہ وہ حکمران جماعت اور سرکاری افسروں کے ایسے ناقابل برداشت غیر جمہوری اقدام پر روک لگا کر یہاں کی صحتمند اور تعمیری اپوزیشن پارٹی کو جمہوری فضا میں کام کرنے کا موقع دیں۔"[1]

[1] "دیوہ سرکشمیر میں نام نہاد الیکشن کی حقیقت" شائع کردہ اننت ناگ ڈسٹرکٹ پرجا سوشلسٹ پارٹی سوپت نگر بورہ۔

سنہ ۱۹۶۲ء کے انتخابات میں بھی چند آزاد امیدوار، بچی کھچی ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کے کچھ امیدوار اور پرجا سوشلسٹ پارٹی کے دو امیدوار یہاں میدان کارزار میں آگئے۔ جن میں شری اوم پرکاش صراف حلقہ اسمبلی امیراکدل سے شری شیام لال صراف کے خلاف اور میں حلقہ عبہ کدل سرینگر سے شری ڈی۔پی۔ دھر کے خلاف تھا۔ لیکن پھر وہی جلسہ کرنے کی ممانعت، شہری آزادی کا فقدان وغیرہ مسائل درپیش رہے۔ جس پر انتخابات کا بائیکاٹ کیا گیا۔ اور میرے اور شری ملک غلام محمد لیڈر ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس اور آزاد امیدوار شری غلام نبی گوہر کے زیر دستخطی مشترکہ بیان میں بائیکاٹ کی وجوہات دیدی گئی تھیں۔ اخبارات میں اس خبر کی تشہیر ہوگئی۔ سرکاری حلقوں میں ہلچل مچ گئی۔ جموں سے پرجا سوشلسٹ لیڈر شری بلراج پوری نے بائیکاٹ کی خبر کی تردید کی اور ایک اخباری بیان میں بتایا کہ شری اوم صراف برابر سرینگر میں مقابلہ کر رہے ہیں۔ وہ اس وقت تک جموں میں ہی تھے۔ شری پوری کے اس بیان پر اخبار سٹیٹسمین والوں نے یہاں کے اپنے نمایندے شری آر۔ کے۔ کاک سے بذریعہ تار پوچھا کہ مجھ سے اس بارے میں وضاحت دریافت کی جائے۔ انہوں نے ٹیلیفون پر مجھ سے اس بارے میں پوچھا۔ میں نے کہا کہ میں اپنے جموں کے ساتھیوں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کے بعد تفصیلی بیان دیدوں گا۔ بہر حال شام کو ایک ایجنسی نے گاڑی بھجوا کر مجھے اور میرے بھائی کو گھر سے بلایا۔ اور بائیکاٹ کا خیال ترک کر کے انتخاب لڑنے کی ترغیب دیدی۔ اور انتخاب لڑنے کیلئے مالی امداد اور دیگر تمام سہولیات دلانے کا یقین دلایا۔ ان کو غالباً میرے بارے میں غلط اندازہ تھا۔ مجھے سمجھانے کی کوشش کی گئی۔ کہ میرے رویہ سے ہندوستانی مفادات کو بین الاقوامی سطح پر زک پہونچ کر علیحدگی پسند عناصر کے ہاتھ مضبوط ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ میں بائیکاٹ کے فیصلہ کو رد کر کے انتخاب لڑوں۔ لیکن میں نے اور میرے بھائی صاحب نے ان کی پیشکش کو ٹھکرا دیا

اگلے دن میں ایک تفصیلی بیان اخبارات کیلئے تیار کر رہا تھا کہ نیچیلیٹو کونسل کے کونسل کے چیرمین شری شیونرائین فوطیدار کا ٹیلیفون آیا کہ میں اور میرے بھائی صاحب انہیں فوراً ملیں۔ ضروری کام ہے۔ میں نے بھائی صاحب کو امیرا کدل میں ڈھونڈھ نکالا اور پھر فوطیدار صاحب کی کوٹھی پر چلے گئے۔ انہوں نے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال کر ملکی اور ذاتی مفادات کا واسطہ دے کر حکومت کے ساتھ تعاون کرنے کا مشورہ دیا اور بائیکاٹ نہ کرنے کا سمجھاؤ دے دیا۔ لیکن میں یہ مشورہ قبول کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوسکا بلکہ میں نے اخبارات کے لئے تیار کیا ہوا اپنا سخت بیان سُنا دیا۔ اس پر فوطیدار صاحب نے کہا کہ وہ ضروری کام سے کہیں جارہے ہیں۔ اور جب تک نہ وہ واپس آئیں گے۔ ہم وہاں سے نہ چلے جائیں۔ قرابت داری کی وجہ سے ہم وہاں ٹھہرے۔ لیکن فوطیدار صاحب دیر تک واپس تشریف نہیں لائے۔ بعد میں انہوں نے بخشی صاحب کے ہاں سے ٹیلیفون کیا کہ ہم لوگ وہاں ہی کھانا کھالیں۔ اور رات بھر وہیں ٹھہریں اور کچھ دیر تک وہ بھی آجائیں گے۔

ہم نے کھانا بھی وہاں ہی کھالیا۔ اور فوطیدار صاحب تشریف بھی لائے۔ رات بھر وہاں ہی قیام بھی کیا۔ فوطیدار صاحب نے پھر نصیحت کی لیکن اس پر عمل نہ کرسکے۔ اور دوسرے دن وہاں سے چل پڑے۔ اپنے ترش اخباری بیان کو ٹائپ کرایا۔ لیکن اخبارات میں تقسیم کرانے سے پہلے جموں سے شری اوم صراف، شری پوری وغیرہ یہاں تشریف لے آئے۔ اور انتخابی میدان میں امڈ پڑے۔ شری اوم صراف نے گلہ کیا کہ میں نے اپنے وطیرہ اور بائیکاٹ کے فیصلہ سے ان کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا ہے۔ میں نے احتیاط کی کہ میری مخالفت کی وجہ سے ان کو خواہ مخواہ کی پریشانی نہ ہو۔ اس لئے میں نے اپنے ساتھی کی خاطر، حکومت، الیکشن کمیشن اور ان کے خلاف تیار کیا ہوا نیا بیان اخبارات کو بھیج دینے سے روک لیا۔

حکمران جماعت ریاست جموں و کشمیر میں آزادانہ طریقے پر انتخابات ہونے میں ہمیشہ سدِ راہ بنی۔ اپنی کامیابی حاصل کرنے کیلئے نازیبا حربے

استعمال کرنے سے بھی کبھی جھجک محسوس نہیں کی۔ اس طرح سے انتخابات میں "شاندار کامیابی" حاصل کر کے بے پناہ اختیارات والی حکومت بحال رہتی۔ پنڈت پریم ناتھ ڈوگرہ نے ریاستی اسمبلی میں ۳۰ رجولائی ۱۹۵۷ء کو تقریر کرتے ہوئے کہا تھا

"الیکشن کے دوران وہ بدعنوانیاں اور بے ضابطگیاں ہوئیں، جو بیان سے باہر ہیں۔ وقت کی کمی کی وجہ سے میں اس موقعہ پر ان تفاصیل میں نہیں جا سکتا، دوسرے کسی موقعہ پہ ہاؤس کے سامنے رکھوں گا کہ کس طرح برسر اقتدار پارٹی نے بیلٹس (ووٹوں) کی بجائے بیلٹ بکسز (صندوقچیوں) کو sweep کر لیا ہے۔ اس کی اگر صحیح کہانی بیان کی جائے۔ تو ہٹلر اور مسولینی جیسے فاسسٹوں کے بھی رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ پرجا پریشد کی مانگ ہے کہ الیکشن میں دھکے شاہی و غنڈہ گردی کی آزادانہ جوڈیشل طور پہ تحقیقات کروائی جائے اور آج ہاؤس کے سامنے اس مانگ کو پھر دوہراتا ہوں اور اگر اس قسم کے کمیشن کا تقرر عمل میں لایا جائے۔ اور اس کے سامنے سارے واقعات رکھے جائیں۔ تو وہ کمیشن یہ verdict (فیصلہ) دیگا کہ ریاست کی یہ اسمبلی اور گورنمنٹ قانون کی گورنمنٹ نہیں ہی ہے بلکہ یہ ایک ایسی گورنمنٹ ہے۔ جس کا قیام ایک منظم غنڈہ گردی کے تحت عمل میں آیا ہے" [1]

صادق وزارت بھی اسی پرانی ڈگر پہ چل پڑی اور ۱۹۶۷ء نے انتخابات کو ایک مذاق بنا کے رکھ دیا۔ حسب سابق جلسوں اور جلوسوں کی آزادی کے بغیر انتخابات کرائے جانے کا اعلان ہوا۔

"ریاست جموں و کشمیر میں بھی ملک کے دوسرے حصوں کے ساتھ

---

[1] منقول از اخبار "سودیش" جموں مورخہ ۱۹ر اگست ۱۹۵۷ء

ساتھ انتخابات ہونے والے ہیں۔۔۔۔۔۔لیکن ابھی تک شہری آزادیوں پر سنگین قسم کی پابندیاں عائد ہیں۔ جلسوں، جلوسوں اور مظاہروں کی آزادی پر دفعہ ۱۴۴ کی آہنی چادر پڑی ہوئی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔
جہاں تک برسر اقتدار کانگریس کی سرگرمیوں کا تعلق ہے۔ وہ تو تمام پابندیوں سے مبرا ہے۔ وہ آزادی کے ساتھ جلسے بھی کر سکتی ہے / جلوس بھی نکال سکتی ہے۔ اور دوسری سرگرمیاں بھی جاری رکھ سکتی ہے۔ دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کا مطلب، تو حزب مخالف کی سرگرمیوں پر روک لگانا ہے" [۱]

مخالف امیدواروں کے کاغذات نامزدگی بے تحاشا مسترد کرائے گئے۔ اور اس طرح سے ۲۲ نشستیں بلا مقابلہ جیت کر صادق صاحب نے اپنے اقتدار کو بحال رکھنے کا ذریعہ نکال لیا۔ اس انتخاب پر تبصرہ کرتے ہوئے یہاں کی کچھ اہم ہستیوں نے تعجب کا اظہار کیا ہے۔ یہ بیان ا ایک پمفلٹ "ضمنی انتخاب کا ڈھونگ" میں مندرج ہے۔ اور ان اصحاب کے اسمائے گرامی دستخط کنندگاں میں شامل ہیں۔ شیخ محمد عبداللہ، مولوی محمد فاروق (بانی صدر عوامی ایکشن کمیٹی) مرزا محمد افضل بیگ (بانی صدر محاذ رائے شماری) محمد یاسین ہمدانی (سربراہ جمعیت ہمدانیہ) غلام محی الدین قرہ (بانی صدر پولیٹیکل کانفرنس) محمد عباس انصاری (نمائندہ اتحاد المسلمین) افتخار احمد انصاری (صدر جموں و کشمیر شیعہ ایسوسی ایشن) سید قاسم شاہ بخاری (صدر انجمن تبلیغ الاسلام)۔ اس پمفلٹ میں درج ہے :-

"وادیٔ کشمیر میں اسمبلی کی چوالیس (۴۴) نشستیں ہیں۔ جن میں سے فروری ۱۹۶۷ء کے انتخابات میں بائیس (۲۲) بلا مقابلہ کانگریس حکمران پارٹی کی جھولی میں پڑ گئیں۔ کیونکہ چن چن کر مقابلہ کے امیدواروں کے

[۱] اخبار "کشمیر" سرینگر مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۹۶۶ء

فارم مسترد کر دئے گئے۔ ہندوستان کا نیشنلسٹ پریس بھی یہ فراڈ دیکھ کر ششدر رہ گیا۔"

صادق وزارت میں بھی عوام کا اعتماد جمہوری اداروں اور سرکاری مشینری پر سے اڑ گیا۔ اس صورت حال پر اظہار افسوس کرتے ہوئے ملک کے بڑے بڑے قانون دانوں، عالموں اور دانشوروں و صحافیوں نے اس کی تحقیقات کا مطالبہ کیا تھا جن میں سروشری سی، ڈی، دیشمکھ۔ ایم، سی ستلواد۔ مہر چند مہاجن۔ کے، جی، سیارین۔ فرینک مورس وغیرہ شامل تھے ۱۶ فروری ۱۹۶۷ء کو اخبارات میں ان کے زیر دستخطی شایع شدہ مشترکہ بیان کے مندرجہ ذیل اقتباسات کا حوالہ دینا مناسب ہے۔

"پچھتر ۷۵ انتخابی حلقوں والی کشمیر اسمبلی کے انتالیس ۳۹ انتخابی حلقوں میں ۱۱۸ کاغذات نامزدگی مسترد ہوگئے ہیں۔ ان میں بائیس ۲۲ بلا مقابلہ امیدواراں بھی شامل ہیں۔ اس سے کشمیر کے انتخابات منصفانہ طور ہونے میں شدید شکوک پیدا ہوگئے ہیں۔ اسطرح سے ہندوستان کی بین الاقوامی شہرت اور قومی اداروں و ملک کے جمہوری مستقبل پر اعتماد کو زک پہنچتا ہے۔ اس لئے اس معاملہ کو لمبے عرصہ کے مروجہ قانونی پیچ داؤ کی انتخابی عذر داریوں سے حل نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ عمدہ طریقے پر اعلیٰ اختیارات والے حاکم سے اس کی تحقیقات فوراً ہونی چاہئے۔ ہم مانگ کرتے ہیں کہ اس تحقیقات کے نتیجہ تک کشمیر میں انتخابات ملتوی کئے جائیں"۔[۱]

ان انتخابات کے بارے میں رائے شماری محاذ کی جانب سے شایع کردہ کتابچہ میں اخبار "کشمیر ٹائمز" مورخہ ۷، جنوری ۱۹۶۷ء کا حوالہ دیکر سرینگر

---

[۱] کشمیر میں ۱۹۶۷ء کے انتخابات پر طائرانہ نظر صفحہ ۲ ناشر محاذ رائے شماری سرینگر۔

میں دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کے نفاذ کی وجہ سے جلسوں اور جلوسوں پر پابندی کا ذکر کیا ہے۔ اخبار نے لکھا ہے کہ

"یہ (پابندیاں) بیشک آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کے بارے میں کیئے گئے متعدد اعلانات کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی ہیں۔ آزادانہ انتخابات کی بات کرنا بیہودہ ہے۔ کیونکہ سرکاری مشینری اور ذرائع ایک جماعت کیلئے کھلے بندوں استعمال کئے جاتے ہیں۔ انتخابات کو آزادانہ کہنا بھی بالکل فضول بات ہے کیونکہ امیدواران اور رائے دہندگان دونوں کو شہری آزادیوں سے محروم رکھا گیا ہے"

اس کتابچہ میں مزید لکھا گیا ہے کہ

"انتخابات کی تاریخیں حکمران جماعت کی مرضی سے اپوزیشن کی مشکلات کے پیش نظر مقرر کئے جاتے ہیں...... چار مخالف جماعتوں نیشنل کانفرنس، جن سنگھ، پی۔ ایس۔ پی اور ہندو مہاسبھا نے تاریخ پہلے لانے کی نکتہ چینی کی"

آگے چل کر لکھا گیا ہے کہ

"پرجا سوشلسٹ پارٹی کی قومی ایگزیکٹو نے ۱۲ مارچ ۱۹۶۷ء کو واقعات کا اعادہ کر کے کہا کہ "نئے انتخابات کرانے سے ہی ریاستی لوگوں کا اعتماد جمہوری طرز عمل پر بحال ہو سکتا ہے"

ریاست جموں و کشمیر کی اسمبلی میں کل ۷۵ نشستیں ہیں لیکن انتخابی عذر داریاں وائیر ہوئیں پچاس۔ اتنی زیادہ انتخابی عذرداریاں ملک کے کسی بھی بڑے سے بڑے صوبہ میں بھی وائیر نہیں ہوئیں۔ یہ سب کچھ ہندوستانی الیکشن کمیشن کی ریاست میں براہ راست عملدار ہونے کے بعد بھی اور جمہوریت کی دہائی دینے والی صادق سرکار میں ہوا۔

"کانگریس پارٹی اگرچہ پھر برسر اقتدار آئی۔ لیکن اس کو وادی میں کل رائے دہندگان میں سے صرف ۱۲ فیصدی ووٹ ملے ہیں۔

باقی ماندہ ووٹ ہیں یا اپوزیشن کے یا جنہوں نے ووٹ دینے سے اجتناب کیا۔ اور ان کے جو بلا مقابلہ والے حلقہ ہائے انتخاب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۸۸ فیصدی ووٹوں کا جو بھی انتساب ہوگا لیکن بہ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو موجودہ حکومت کی قائمی میں احساس شمولیت نہیں ہو سکتی" لہ

بار ایسوسی ایشن سرینگر کی طرف سے دئے گئے دعوت عصرانہ کی تقریب پر تقریر کرتے ہوئے مسٹر شیخ محمد عبداللہ نے ۲۰ مارچ ۱۹۶۸ء کو اس پر یوں مایوسی کا اظہار کیا۔

"ہندوستان کی جمہوریت پٹھان کوٹ کے اس طرف ختم ہو جاتی ہے۔ اور ریاستی عوام اس سے غیر اثر انداز رہتے ہیں۔ سارے ہندوستان میں عام انتخابات ہوئے۔ ریاست جموں و کشمیر میں بھی انتخابات ہندوستانی الیکشن کمیشن کے ماتحت کرائے گئے۔ لیکن ان میں واضح فرق ثابت ہوا کہ ہندوستان میں کیسے انتخابات ہوتے ہیں اور یہاں کس طرح سے ہوتے ہیں اور اس بارے میں آہ و فریاد کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی ہے" ۲ہ

پنچایتی انتخابات میں بھی سرکار غیر جانبدار نہ رہ سکی۔ وادی کشمیر میں یہ انتخابات صرف دو جماعتوں کانگریس اور محاذ رائے شماری کے درمیان لڑے گئے۔ محاذ رائے شماری کی طرف سے مجھے بھی ایک وکیل مقرر کئے جانے کی وجہ سے حالات کا مشاہدہ کرنے کا موقعہ ملا۔ (حالانکہ آج تک محاذ رائے شماری نے میری فیس کا بل نہیں چکایا ہے) اس میں بھی حکمران جماعت

لہ شری بلراج پوری کا مضمون بحوالہ "انڈین ایکسپریس" مورخہ ۲ جون ۱۹۶۷ء

۲ہ تقریریں اور ملاقاتیں — شیخ عبداللہ ۱۹۶۸ء۔ ناشر محاذ رائے شماری سرینگر

حسب دستور اپنی دھاندلیوں میں پیچھے نہیں رہی۔ اور ۱۹۷۱ء کے حالیہ ضمنی پارلیمانی انتخابات میں بھی صادق وزارت نے اپنے کرتب دِکھائے۔ جس کے خلاف جماعت اسلامی سرینگر نے اپنے امیدواروں کی شکایات پر زبردست احتجاج کیا۔ صادق صاحب نے اپنا پرانا حساب چکانے کی غرض سے اپنے کانگریسی امیدوار شری بخشی غلام محمد کو گرانے میں اپنا سارا زور لگا لیا۔ اور اس سلسلہ میں بیگم عبداللہ وغیرہ کے ساتھ درپردہ طور اشتراک کرکے بخشی صاحب کو شکست دلا دی۔

Khan M. Ismail Khan

S/0

اقتدار کی ہوس

پچھلے صفحات کے مطالعہ سے آپ پر یہ روشن ہو چکا ہوگا۔ کہ ۱۹۵۳ء میں
بخشی غلام محمد نے اپنے اقتدار کو قائم و دائم رکھنے کیلئے کون کون پاپڑ بیلے اور صا
گروپ کو استعمال کرکے اس کے بل بوتے پر اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کی کس ت
تگ و دو کی۔ خود نیشنل کانفرنس کے صدر بن گئے۔ اور حکومت کے وزیر اعظم بھی
اپنے رشتہ داروں سمیت حکمران جماعت پر چھا جانے کی کوشش کی۔ مسٹر بخشی
عبدالرشید کو مولانا محمد سعید مسعودی کی جگہ نیشنل کانفرنس کا جنرل سیکریٹری بنوا
تاکہ تنظیم اور حکومت میں ان کا غلبہ رہے۔ دوسری طرف سے صادق گروپ
بھی اپنے اقتدار کو مستحکم اور مضبوط بنانے کی فکر میں سرکار اور نیشنل کانفرنس
میں اپنے آدمیوں اور کارکنوں کو زیادہ سے زیادہ آگے آگے بڑھانے کی
کوششیں کرتا رہا۔ نتیجہ کے طور پر یہ دونوں گروپ جماعت اور حکومت کے
اندر اور باہر خفیہ طور ایک دوسرے کے برسر پیکار رہے اور ان کے تعلقات
اتنے بگڑ گئے۔ کہ یہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے پر تل گئے۔ اور حکومت میں
ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کی پیشبندی کی کوشش کرتے۔

بخشی صاحب اپنی من مانی کاروائیاں کرنے کی راہ میں حائل وزیروں
کو گرانے کے منصوبے باندھتے رہے۔ اور ۱۹۵۷ء کے اسمبلی انتخابات
میں ان کی پیٹھ میں چھرا گھونپ کر ان سے انتقام لینا چاہتے تھے۔
آپ شری شیام لال صراف کو بھی صادق گروپ کا حمایتی ہونے کی وجہ
سے انتخاب میں گرا کر وزارت سے علیحدہ کرنا چاہتے تھے۔ آپ نے
صراف صاحب پر سازش کرنے کا الزام لگایا تھا۔ کہ وہ دہلی کے
سرکاری حلقوں میں آپ کے خلاف کہتے رہے ہیں۔ اگست ۱۹۵۶ء

میں منعقد ہوئی نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں بخشی صاحب نے صراف صاحب اور دیگر ساتھیوں پر یہی الزام لگایا۔ نیشنل کانفرنس سے علیحدہ ہونے پر صادق صاحب نے پریس کانفرنس میں جو بیان دیا۔ اس میں آپ نے یہ بات دہرائی۔

"میٹنگ میں مجھے بہت حیرانی ہوئی۔ جب بخشی صاحب نے کابینہ اور مجلس عاملہ کے کچھ ساتھیوں پہ سازش کے الزامات لگائے خاص کر انہوں نے شری شیام لال صراف پر الزامات لگائے … میں نے ان سے (بخشی صاحب سے) استدعا کی کہ مجھے مطمئن کریں تاکہ میں بھی اپنا رویہ بنالوں۔ بخشی صاحب دہلی گئے وہاں سے آنے کے بعد میں نے ان سے دوبارہ یہی استدعا کی آخر کار کابینہ کے ایک اجلاس میں انہوں نے دو ایک باتیں کیں مثلاً یہ کہ صراف صاحب نے دہلی میں کبھی بخشی صاحب کی ذات کے متعلق کچھ کہا تھا۔ بخشی صاحب کے کہنے کے مطابق یہ واقعہ آٹھ نو مہینے پہلے ہوا تھا۔ میں نے پوچھا کہ اتنی دیر آپ نے خاموشی کیوں اختیار کرلی اور مجھے کیوں نہیں کہا" ؎۱

وادیٔ کشمیر میں جن جن نشستوں پہ مقابلہ کیا امیدوار کھڑا ہوئے تھے ان میں سے بیشتر امیدوار صادق گروپ کے خلاف کھڑا ہوئے تھے۔ اور صادق گروپ کے جن امیدواروں کے خلاف مقابلہ ہوا۔ بخشی گروپ کے نیشنل کانفرنسی در پردہ ان امیدواروں کی بیخ کنی کرنے لگے اس وقت کے کشمیر اسمبلی کے اسپیکر اور موجودہ وزیر سرکار شری غلام رسول رینزو کے انتخاب نے یہ بات عوام کے سامنے اور بھی واضح کردی۔ انہیں ایک آزاد امیدوار اور موجودہ نیشنل کانفرنسی ایم۔ ایل۔ اے شری غازی

؎۱ ہفتہ وار "کشمیر" سرینگر ۱۹ اکتوبر ۱۹۵۷ء کنونشن نمبر

عبدالرحمان بٹ نے بخشی گروپ کی حمایت سے شکست دیدی۔ دونوں گروپ اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کیلئے تنظیم کے معصوم اور ایمان دار کارکنوں کو اقتدار کی آپسی رسہ کشی پہ قربان کر بیٹھے۔ خود بلا مقابلہ کامیاب ہونے کے بعد جب بخشی صاحب انتخابی مہم کے سلسلے میں جموں چلے گئے تو اپنے روٹھے ساتھیوں کی تحقیر اور اپنی شان میں وہاں ایک عاد مضحکہ خیز اور فریبانہ بیان دے دیا کہ وہ بلا مقابلہ کامیاب ہونے کے بعد بھی مستعفی ہوکر دوبارہ انتخاب لڑنے کو تیار ہیں۔ چونکہ یہ بیان محض دنیاداری اور دکھاوے کی خاطر تھا۔ اسلئے بخشی صاحب کو چیلنج ہونے کے باوجود بھی مستعفی ہوکر ان کا انتخاب دوبارہ لڑنا تو درکنار بلکہ جواب میں وہ خاموشی سے دم دبا بیٹھے۔

"جموں و کشمیر پرجا سوشلسٹ پارٹی کے اعلیٰ حلقوں میں بخشی غلام محمد کے اس بیان کو مضحکہ خیز قرار دیا جا رہا ہے کہ" وہ بلا مقابلہ کامیاب ہونے کے بعد بھی مستعفی ہوکر دوبارہ چناؤ لڑنے کو تیار ہیں۔ ایک ... نہیں بلکہ دو بار، پانچ بار بلکہ دس بار بھی وہ دوبارہ چناؤ لڑنے کو تیار ہیں۔" پرجا سوشلسٹ حلقوں کی رائے ہے کہ اول تو کسی جانب سے بخشی صاحب کو چیلنج نہیں دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود اگر ان کو یا ان کے کسی ساتھی کو لڑ کر ہی کامیاب ہونا کا اتنا شوق تھا تو انہیں مخالف امیدواروں کے کاغذات مسترد ہونے کے دن ہی مستعفی ہوجانا چاہئے تھا۔ اس کے برعکس انہوں نے پڑتال میں کامیاب ہونے والے مخالف امیدواروں سے بھی دستبرداری حاصل کرنے کیلئے کیا کیا پاپڑ بیلے۔ وہ سب پر عیاں ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود پرجا سوشلسٹ پارٹی اب بھی تیار ہے۔ کہ وہ "شاندار طور کامیاب ہونے والے" نیشنل کانفرنسی دوستوں کو یہ چانج لینے کا پورا پورا موقع دے کہ وہ مستعفی ہوکر مقابلہ میں حصہ لیں۔" [۱]

---

[۱] اخبار "پرتاپ" جموں، مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹ء

اقتدار کی اس رسہ کشی میں صادق گروپ نے بخشی صاحب سے اصرار کیا تھا کہ جس طرح کانگریس میں یہ رواج بن گیا ہے کہ ایک شخص صرف ایک عہدے پر فائز رہ سکتا ہے۔ اسی طرح آپ یا صرف وزیراعظم رہیں یا نیشنل کانفرنس کے پریذیڈنٹ بنے رہیں۔ وزیر اعظم ہونے کی وجہ سے آپ زیادہ مصروف رہتے ہیں۔ اسلئے تنظیم کا قائمقام صدر صادق صاحب کو بنایا جائے۔ اس پر بخشی گروپ کے سینوں پر سانپ لوٹنے لگے۔ اس میں شک نہیں کہ نیشنل کانفرنس کے سنجیدہ کارکنوں کے علاوہ ریاست کا باقی باشعور طبقہ صادق صاحب کے ساتھ تھا۔ (اب تو صادق صاحب کے ساتھ ان کا دربان تک بھی نہیں تھا) لیکن اقتدار کے بل بوتے پر بخشی صاحب کارکنوں کی ایک خاصی تعداد اپنے ساتھ رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ صادق گروپ کے نیشنل کانفرنس سے علیحدگی کے بعد جب میں نے اس کے ایک رہنما سے یہ بات پوچھی کہ اقتدار میں شریک ہوتے ہوئے بھی آپ لوگوں کو اپنے خلاف کھڑا کرائے گئے امیدواروں کی علمیت نہیں رہی۔ اس کا سبب کیا ہے؟ اس پر جواب ملا کہ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ چن چن کر اور دیدہ و دانستہ طور ہمارے گروپ کے سرکردہ لیڈروں کے خلاف ہی مخالف امیدوار کھڑا کرائے جائیں گے۔ پھر جب ہم نے حکومت ہند کی توجہ اس طرف دلائی تو ہوم منسٹر شری گوبند وبھ پنت نے کہا کہ آپ لوگوں کو تو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہم نے بخشی صاحب کو ایک علیحدہ رقم انتخابات کا مقابلہ کرانے کیلئے دیدی اور خاص طور پر پرجا سوشلسٹ پارٹی کیلئے دیدی۔ اسلئے وادی میں آپ نیشنل کانفرنسیوں نے ہی مخالف امیدوار کھڑا کئے ہیں۔ لیکن پرجا سوشلسٹ پارٹی کے اس وقت کے چیرمین شری ادم صراف اور مجھ جیسے پارٹی کارکنوں کو نہ ہی بخشی صاحب نے اور نہ ہی پارٹی سیکرٹری عمر بٹ نے اس بارے میں اعتماد میں لیا اور نہ ہی میں اس دلیل کی جوازیت یا عدم جوازیت

یہاں یہاں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

دونوں گروہوں کو اقتدار کی چاٹ اس قدر لگی ہوئی تھی کہ لیلائے وزارت کے پیچھے دیوانے بنے پھرتے تھے۔ لیکن اختلافات کی خلیج اس قدر وسیع ہوگئی کہ انہیں ایک دوسرے سے منہ موڑنا ہی پڑا، کسی اصول پرستی کی خاطر نہیں۔ ٹھوس سیاسی عقائد کی وجہ سے بھی نہیں، عوام کی ہمدردی میں بھی نہیں، البتہ اپنے سیاسی حلوے مانڈے کیلئے، موقعہ پرستی کی ناک میں رہنے کیلئے اور بالآخر عوام کو الو بنانے کیلئے۔ ۱۹۵۷ء کے انتخابات کے بعد بخشی صاحب نے صادق گروپ کے جن ایک دو وزیروں کو دوبارہ وزارت میں شامل ہونے کی دعوت دی تھی انہوں نے اس دعوت کو اس بناء پر نامنظور کر لیا کہ اس وقت بخشی وزارت کے خلاف لوگوں اور کارکنوں کا کچھ رجحان بن گیا تھا۔ اس لئے وہ حزب مخالف کے لیڈر بن سکتے تھے اور موقعہ ملنے پر دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کر سکتے۔ ان کے خلاف چونکہ انتخابی عذر داریاں تھیں۔ اس لئے انہیں خطرہ رہا کہ بخشی صاحب زور لگا کر ان کی انتخابی عذر داریاں منظور کروا کر انتخاب میں انہیں گرا دیں گے۔ اور اس موقعہ کو کھو کر وہ سنبھل نہیں پائیں گے۔ بخشی صاحب کی بھی یہی چال تھی کہ ان کو ابھرتے ہوئے ماحول سے نکال کر اور باقی کارکنوں سے علیحدہ کرکے ایک بے بال و پر پنچھی کی طرح انہیں اپنے دام قفس میں رکھیں۔ بیشتر پرانے وزیروں کا بخشی صاحب کے خلاف صف آراء ہو جانا بخشی صاحب کیلئے پریشانی کا باعث بنا۔ انہوں نے اس رویہ کو ایک طرح کا عدم اعتماد اپنے اوپر سمجھ لیا۔ اسلئے بخشی صاحب نے شری شام لال صراف کی وزارت کے عوض اپنی وفاداری کی پیشکش کو قبول کرکے صراف صاحب کو نئی وزارت میں دوبارہ لے لیا۔ صراف صاحب نے یکسر اپنے فن کا نادر مظاہرہ کرکے ایسی زور دار چھلانگ بخشی کیمپ میں لگائی۔ کہ صادق گروپ والے تھامنے سے بھی ان کو تھام نہ سکے۔ بینے سے لگانے کے

باوجود بھی ان کو دل سے لگا نہ سکے۔ صراف صاحب صادق صاحب اور ڈی۔ پی۔ در صاحب نے بخشی صاحب اور نیشنل کانفرنس کے جنرل سیکرٹری شری بخشی عبدالرشید پر الزام لگایا تھا کہ آپ نے ان کے مقابلہ کیلئے پرجا سوشلسٹ پارٹی کے امیدوار کھڑا کر رکھے ہیں اور آپ پرجا سوشلسٹ پارٹی کے ذریعہ سے ان کو ختم کرانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ایک دن وزیر اعظم کشمیر بخشی غلام محمد کی طرف سے ان سے فوراً ملنے کا پیغام آیا۔ ہیں اور کچھ دیگر ساتھی وہاں گئے۔ لیکن خواجہ عمر بٹ نہیں آئے۔ وہاں بخشی صاحب کے علاوہ شری شیام لال صراف اور شری بخشی عبدالرشید تھے۔ صادق صاحب ہمارے پہونچنے سے پہلے ہی اٹھ کے چلے گئے تھے بخشی صاحب نے ہم سے کہا کہ صراف صاحب۔ صادق صاحب اور کچھ دوسرے ساتھیوں کی شکایت ہے کہ میں نے اور رشید صاحب نے پرجا سوشلسٹ پارٹی کے امیدواروں کو ان کے خلاف کھڑا کیا ہے۔ میری اور رشید صاحب کی صفائی سے یہ مطمئن نہیں ہوتے ہیں۔ اس لئے آپ وضاحت کریں تاکہ ان کا شک دور ہو جائے۔ اس کی وضاحت ذمہ داری کے ساتھ خواجہ محمد عمر بٹ کر سکتے۔ لیکن وہ نہ آئے۔

ہم نے صادق گروپ کو وعدہ دیدیا کہ وہ وزارت سے باہر آکر اپوزیشن کو مضبوط کریں تاکہ ملکی اور عوامی بھلائی کیلئے اور آمرانہ حکومت کا مقابلہ کرنے کے لئے موثر کوشش ہو سکے۔ اس غرض کیلئے پرجا سوشلسٹ پارٹی نے صادق گروپ کے خلاف دائر کی گئی انتخابی عذرداریاں واپس لینے کا خیال ظاہر کیا۔ اگرچہ شروع میں صادق گروپ مایوس ہو گیا لیکن بعد میں ان کیلئے کوئی چارہ نہیں رہا۔ کہ وہ وزارت سے علیحدہ ہو جائیں اور تب نیشنل کانفرنس سے بھی علیحدہ ہونا پڑا۔ لیکن پرجا سوشلسٹ پارٹی بحیثیت مجموعی اپنے وعدے پر کاربند نہ رہ سکی۔ کیونکہ اس کے پیچھے تار کھینچنے والے بخشی برادراں تھے۔ جنہوں نے اپنے ذاتی اقتدار کی خاطر پرجا سوشلسٹ پارٹی کی جڑیں کاٹ ڈالیں۔ اور اس کے کچھ ایماندار کارکنوں کی خودداری اور غیرت کو اپنے ذاتی مفاد پر قربان کر دیا۔ صادق گروپ یہ صورت حال دیکھ کر گھبرا اٹھا کہ اگر کہیں ان کے خلاف عذرداریاں

منظور ہو کر بنیا چناؤ لڑنا پڑے تو ان کا پٹ جانا یقینی ہے۔ کیونکہ غیر جانبدارانہ اور آزادانہ ماحول میں انتخاب ہونے کی کوئی توقع نہیں تھی۔ اس لئے قانون ساز اسمبلی میں صادق گروپ نے اس بات پر زور دیا اور قرار داد پیش کی کہ ریاست جموں و کشمیر کو ہندوستان کے الیکشن کمیشن کے دائرہ اختیار میں لایا جائے۔ لیکن حکمران جماعت نے اس وقت اس مطالبہ کو ٹھکرا دیا۔ بہر کیف صادق صاحب کے خلاف انتخابی عذر داری خصوصی طور پر صادق صاحب اور ان کے دیگر ساتھیوں کیلئے بدستور ذہنی عذاب کا باعث بنی۔ اسلئے انہوں نے صادق صاحب کے خلاف پرجا سوشلسٹ پارٹی کے عذر دار شری ڈی۔ این۔ جلالی کو اپنے ساتھ ملانے کا فیصلہ کیا۔ تاکہ صادق صاحب کے خلاف انتخابی عذر داری ناکام ہو جائے۔ میں پارٹی میں باغی خیالات کا حامل تھا۔ اسلئے میں چاہتا تھا کہ اس وقت جمہوری بقا کیلئے صادق گروپ کمزور نہ ہو جائے۔ اور بخشی گروپ کی آمریت کو تقویت نہ مل جائے چنانچہ جلالی صاحب میرے مشورہ کیساتھ صادق گروپ کیساتھ مل گئے۔ اس کام میں پرجا سوشلسٹ پارٹی کے ایک اور رکن اور موجودہ ممبر اسمبلی شری مکھن لال فوطیدار (وٹن) نے بھی شری جلالی کی ڈھارس بندھائی۔ اس کے ساتھ ہی بخشی گروپ کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے۔ شری ڈی۔ این۔ جلالی روپوش ہو گئے تھے اور پولیس انہیں چاروں اور ڈھونڈنے لگی۔ شری ڈی پی۔ در نے احتیاط کے طور پر شری جلالی کو ایک عرصہ تک روپوش رکھا۔

ادھر انتخابی عذر داریوں کا مقصد فوت ہوتا دیکھ کر بخشی صاحب پریشان ہو گئے۔ اور ادھر صادق صاحب اور ان کے کچھ ساتھی لیلائے اقتدار کی فرقت دیر تک برداشت نہ کر کے حوصلہ شکن ہو گئے۔ اس لئے دونوں گروہوں نے کچھ عرصہ بعد نرمی اختیار کر کے مشترکہ طور قلمدان وزارت سنبھالنے کیلئے خفیہ طور دوڑ دھوپ کی۔ اور ایک دن کارکنوں کی اکثریت کے خلاف صادق صاحب، ڈی۔ پی۔ صاحب، گردھاری لال ڈوگرہ صاحب اور میر قاسم صاحب ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کو توڑ کر پھر نیشنل کانفرنس میں شامل ہو گئے۔ پھر دوبارہ منسٹر بن گئے۔ اس طرح سے یہاں

کے لوگوں کیساتھ جمہوریت کے نام پر صادق صاحب کی رہنمائی میں بڑا دھوکہ ہوا اور اقتدار کی ہوس میں ابھرنے والی عوامی تحریک کو کاری ضرب لگائی گئی۔

کامراج پلان کے تحت وزارت عظمیٰ سے ۱۹۶۳ء میں بادل ناخواستہ علیحدگی کے بعد بخشی صاحب نے بلا واسطہ طور اقتدار قائم رکھنے کیلئے ہاتھ پاؤں مارے۔ اور ایک کٹھ پتلی وزارت کے قیام کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ صادق صاحب کی ہوائیاں اڑ گئیں کیونکہ وہ بخشی صاحب کے ساتھ دوسرے کمانڈر تھے۔ لیکن اس ریشہ دوانی سے ان کا وزارت میں آنا بعید از امکان تھا۔ حالانکہ کامراج پلان کے تحت بخشی صاحب کا استعفیٰ منظور ہونے کے بعد صادق صاحب نے بخشی صاحب کے ساتھ نقلی ہمدردی ظاہر کرکے اس اقدام کو غیر مناسب قرار دیا تھا۔ بہر حال اقتدار کی اس رسہ کشی میں بخشی صاحب نے صادق صاحب کے ساتھ زیادتی کی۔ اور انہیں دیدہ دانستہ طور نظر انداز کرکے خواجہ شمس الدین کو نیشنل کانفرنس پارلیمنٹری پارٹی کا لیڈر چنوایا اور اس طرح سے انہیں اپنا جانشین چن کر کرسی وزارت اعظمیٰ پہ براجمان کرایا۔ اور نئی وزارت کو موضوع مذاق بناکر اپنے اثر و رسوخ میں رکھ لیا۔ صادق صاحب اقتدار چھن کر مایوسی کے عالم میں پڑے۔

وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو بخشی صاحب کی اس کارستانی پہ خوش نہیں ہوئے۔ انہوں نے پہلے ہی صادق صاحب کو وزیر اعظم کشمیر چننے کا مشورہ بخشی صاحب کو دیدیا تھا۔ اسلئے وہ صادق صاحب کو وزیر اعظم بنانے کی تاک میں تھے چند مہینوں کے اندر اندر ہی موئے مقدس کی تحریک کے بعد حکومت ہندوستان کی مداخلت پر شمس الدین وزارت مستعفی ہوگئی اور صادق صاحب کو وزارت اعظمیٰ کی کرسی سونپی گئی۔ صادق صاحب وزیر اعظم کیا بن گئے کہ بخشی گروہ کی چھاتی سانپ لوٹنے لگے۔ ابھی صادق صاحب سنبھل نہیں پائے تھے کہ بخشی گروہ نے طاقت آزمائی کی خاطر سپیکر اسمبلی کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک اسمبلی میں پیش کرنے کی ٹھانی۔ صادق صاحب نے اقلیت میں اپنے آپ کو محسوس کرکے اگلے دن صبح سویرے مسٹر بخشی غلام محمد کو احتیاطی نظربندی قانون کے تحت گرفتار کراکے

تارائیل سپیشل جیل اودھمپور بھجوادیا۔ اور صدر ریاست (اس عہدہ کا نام بعد میں گورنر میں تبدیل کیا گیا) سے اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرایا۔ اس کے بعد اسمبلی ممبران کے ساتھ سودا بازی ہونے لگی۔ اس غیر جمہوری ڈھنگ سے وزیر اعظم (اس عہدہ کا نام بعد میں وزیر اعلیٰ میں تبدیل کیا گیا) خواجہ غلام محمد صادق نے اپنی وزارت کو بچایا۔ ریاست جموں و کشمیر کی جمہوری روایات کے تابوت میں ایک اور کیل لگادی گئی!۔

غیر عوام سے آنکھیں چرانے والے ایک وقت کے ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس لیڈر اور بعد کے وزیر اعظم خواجہ غلام محمد صادق کی شروع میں بےبسی اور بےکسی سمجھ میں آ سکتی۔ لیکن اس کا کیا کہیے کہ ۱۹۷۰ء میں ان کے اپنے آدمیوں نے ان سے غیر مطمئن ہوکر ان کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد منظور کرنے کا سماں باندھا اور آپس میں کیا ٹھن گئی کہ صادق صاحب کی جمہوریت اور اصول پرستی کا لبادہ تار تار ہوگیا اور لیلیٰ اقتدار کا سرکش مجنون پارلیمانی اور جمہوری بندشوں کو توڑ کر اس سے دیوانہ وار بوس و کنار کرنے لگا۔ ۱۹۶۴ء کے عدم اعتماد کے وقت صادق صاحب کہنے کو تو کہہ سکتے کہ بیشتر ممبران اسمبلی بخشی صاحب کی عنایت کی وجہ سے منتخب ہو چکے تھے اور ان کے زیر اثر تھے۔ اس لئے صادق صاحب کو ان کی اعانت آسانی کے ساتھ حاصل کرنے میں دقت ہوئی۔ لیکن ۱۹۶۷ء کے انتخابات صادق صاحب کے وزیر اعلیٰ ہوتے ہوئے عمل میں لائے گئے تھے۔ اور حکمران کانگریس کے امیدواروں کی فہرست ان کی مرضی سے مرتب ہوئی تھی۔ اور پھر انتخابات میں جو ننگِ جمہوریت دھاندلیاں کی گئیں۔ وہ بھی ان کے سایہ عاطفت میں اور ان کی چشم پوشی سے ہوئی۔ لیکن اس کے باوجود مارچ ۱۹۷۰ء میں کانگریسی ممبران اسمبلی کی اکثریت صادق صاحب کے خلاف صف آرا ہوئی اور ان سے استعفیٰ پیش کرنے کا مطالبہ کیا۔ جموں کے اسمبلی اجلاس میں ان کے خلاف رسمی طور عدم اعتماد کی تحریک پیش ہوجانی تھی۔

اقتدار پرست صادق صاحب ماحول کو بھانپ کر اپنی غیر رسمی شکست

خوردگی پر تلملا ہو اٹھے۔ اور دوبارہ اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہو کر گورنر سے اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرایا۔ تب ممبران اسمبلی کے ساتھ سودا بازی کی تگ و دو شروع ہوگئی۔ ریاست کی جمہوری روایات کے تابوت میں ایک اور کیل ٹھونک دی گئی! ریاست کے گورنر شری بھگوان سہائے جمہوری روایات اور آئینی طرز عمل کا منہ چڑاکر وزیر اعلیٰ صادق صاحب کو مسند وزارت پر بحال رکھنے میں آلہ کار بنے۔ اور اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرنے کے سلسلہ میں مجلس وزراء کے مشورہ پر غیر عقلمندانہ طریقہ پر عمل پیرا ہو گئے۔ شری ٹی۔ آر۔ بھسین ایڈوکیٹ نے گورنر کی اس ناواجب حرکت پر سیر حاصل تبصرہ کرکے رائے دی تھی۔ کہ

"اس پس منظر میں مشورہ پر عمل کرنے کی ذمہ داری گورنر پر عاید ہوتی ہے کیونکہ وہ یہ مشورہ قبول کرنے کے پابند نہیں تھے۔ انہوں نے صاف طور پر ریاستی آئین کے گاف میدان کے غلط سوراخ میں بال لگادی ہے"[1]

صادق صاحب کے مخالف اور شری سید میر قاسم کے حمایتی ممبران قانون ساز یہ اس غیر جمہوری طرز عمل کے خلاف واویلا کرنے کیلئے دہلی گئے۔ اور وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے ساتھ ۱۸ مارچ ۱۹۷۰ء کو ایک ملاقات کے دوران اس بات کی وضاحت کی کہ صادق صاحب کو اکثریت کی حمایت حاصل نہیں ہے۔ اور پارلیمنٹری پارٹی کی لیڈر شپ میں تبدیلی ہونی چاہیے۔ جس ڈھنگ سے اسمبلی کا اجلاس ملتوی کیا گیا۔ انہوں نے اس پر اپنی ناخوشی کا اظہار کیا لیکن شریمتی گاندھی نے صادق صاحب کی ناجائز حمایت کرکے اس وفد کو یہ کہہ کر ٹوکا کہ

"آپ عوام کی نمائندگی نہیں کرتے ہیں اور نہ آپ عوام کے نمائندہ ہو(ں) کے طور پر منتخب ہو گئے ہیں۔ آپ کے انتخاب کیلئے کشمیر سرکار اور الیکشن کمیشن کے اہلکاروں کو کیا کیا بے ضابطگیاں نہ کرنا پڑیں ہیں؟"

اس طرح سے وزیر اعظم جناب شریمتی اندرا گاندھی نے ریاستی کانگریس کے ممبران اسمبلی

۱؎ اخبار کشمیر ٹائمز جموں مورخہ ۱۹ مارچ ۱۹۷۰ء

کی اکثریت کے مطالبہ کو ٹھکرا دیا۔ دریں اثنا خواجہ غلام محمد صادق کی ہدایت پر قلیل وقت کی اطلاع پر کانگریس لیجسلیچر پارٹی کی میٹنگ جموں میں طلب کی گئی قاسم صاحب کے حمایتی ۳۲ ممبران اسمبلی نے دہلی سے چیف منسٹر کو احتجاجی تار دیدیا۔ اور میٹنگ کی منسوخی کا مطالبہ کیا۔ اور ایک دن میں جسمانی طور جموں نہ پہونچ سکنے کی وجہ سے میٹنگ کیلئے عذر کیا۔ اور واضح کیا کہ ممبران اسمبلی کی اکثریت صادق صاحب کی حمایت سے دستکش ہو گئی ہے۔ لیکن صادق صاحب کب ماننے والے تھے۔ ان کے مفادات خطرے میں تھے۔ انہوں نے سنی کو ان سنی کر کے میٹنگ میں حاضر آمادہ اپنے حمایتی ممبران سے اپنے اوپر اعتماد کی قائمی کا سرٹیفکیٹ لے لیا اور اپنا تار تار شدہ لبادہ ترک کر کے خلعت قبولیت پہن لیا اور سچ و پنچ کے جمہوریت کے علمبرداروں کی صف میں پھر قدم رنجہ ہو گئے۔

جمہوریت کے اس خونچکاں ڈرامہ میں شری سید میر قاسم کا کردار قابل تحسین رہا۔ انہوں نے اپنی دل آویز اداکاری اور اپنی جاذب نظر شخصیت سے تماشہ بینوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ اور اپنی جھلکیوں کی چھاپ ان کے ذہنوں پر ایسے نقش کی۔ کہ ڈرامہ کے کچھ مناظر تاریک راہوں میں روشنی کی غمازی کرینگے کشمیر کی گلا کاٹ اور بے شرمانہ سیاسی روایات کے ماحول کو ذرا شروع سے یاد کیجئے اور آج تک کے تمام مناظر ایک ایک کر کے اپنے ذہن کے سیمین پردے پر لائیے پھر مقابلہ کیجئے۔ دیکھئے یہ کیا کم ہے کہ شری سید میر قاسم نے اسمبلی کی ممبری سے استعفیٰ دیدیا ہے۔ انہوں نے ایثار کی ایک مثال قائم کی ہے۔ اور واضح کر دیا ہے کہ وہ اقتدار کی جنگ زرگری کیلئے نہیں بلکہ اپنے اصولوں کے تحفظ کیلئے لڑ رہے تھے۔ ممبر اسمبلی رہ کر وہ صادق صاحب کا اقتدار چھیننے کی خواہش نہیں رکھتے۔ انہوں نے پردیش کانگریس کمیٹی کی صدارت سے بھی علیحدگی اختیار کی تھی تاکہ صادق صاحب اور دوسرے لوگ۔ یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ کسی لالچ کی وجہ سے تنظیم پر حاوی ہو کر رہے۔ اور تنظیمی طور صادق صاحب کے اقتدار کو

دھچکا لگا دیں گے۔ بے شک کشمیر میں پہلی بار صحتمند سیاسی روایات قائم کرنے کی طرف یہ پہلا قدم تھا۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ مدت کے بعد ہی کانگریس ہائی کمانڈ نے ریاست کیلئے قاسم صاحب کی خدمات اور رہنمائی کی ضرورت محسوس کی۔ اور انہیں وزارت اعلیٰ کے جلیل القدر عہدہ سے نوازا۔

دیانتداری کے ٹھیکیدار مسٹر صادق نے اپنی وزارت کے دو سابق وزیروں اور دوسروں کے خلاف الزامات کی تحقیقات کیلئے کمیشن قائم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ انہوں نے کشمیر اسمبلی میں کہا۔ اگر میرے خلاف کوئی شکایت ہے۔ تو کانگریس ہائی کمان سے کی جائے اور اگر میری وزارت کے کسی ممبر یا کسی سابق وزیر کے خلاف کوئی الزام ہو۔ تو مجھے اطلاع دی جائے۔ میں ذاتی طور پر اس کی تحقیقات کروں گا۔ ایسے الزامات کی تحقیقات کیلئے کمیشن قائم کرنے کا مطالبہ منظور نہیں کیا جا سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ صادق صاحب اپنے دھڑے کے ممبروں کے خلاف الزامات کی تحقیقات کیلئے کسی جج یا ٹربیونل پر بھروسہ کرنے کیلئے تیار نہیں۔ بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ اس معاملہ میں انہیں ہی جج تسلیم کیا جائے۔ اور جو فیصلہ وہ کریں۔ اسے ہی درست تسلیم کر لیا جائے۔ صادق صاحب کا فیصلہ کیا ہو سکتا ہے۔ وہ تو اب بھی واضح معلوم ہوتا ہے۔ کہ اگر کوئی شخص ان کی دھاندلی کے آگے ہتھیار نہ ڈالے۔ تو اسے ذلیل کرنے کیلئے ڈیفنس رولز کے تحت نظر بند کر دیا جائے۔ اس کے خلاف کاروائی کے لئے عدالتی کمیشن قائم کر دو۔ لیکن جو شخص ان کی حمایت کرے وہ چاہے کس قدر بد دیانت کیوں نہ ہو۔ صادق صاحب اس کے خلاف کاروائی کرنے کیلئے تیار نہیں۔ ....

صادق صاحب نے دیانتداری کے نام پر جو ڈھونگ رچائے وہ در اصل ان کی ریشہ دوانیوں کا ... ہے انہوں نے نیشنل

کانفرنس پر قبضہ کرنے کیلئے سراسر دھاندلی سے کام لیا۔ کانگریس کی دھاندلی ایسی دھاندلی کا ایک نمونہ ہے۔

.... لیکن جس شخص نے اپنے سیاسی اقتدار کی بنیاد سیاسی بد دیانتی پر رکھی ہو۔ اس میں اخلاقی جرأت کیونکر ہو سکتی ہے" ۵۱

---

۵۱ اخبار "سویرا" دہلی منقول از اخبار "اجالا" جموں مورخہ ھار اپریل سنہ ۱۹۶۵ء

نیشنل کانفرنس میں اختلاف

پچھلے صفحات میں مندرج واقعات کی روشنی میں یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ نیشنل کانفرنس میں واضح طور پر دو گروہ موجود تھے۔ سنہ ۱۹۵۳ء میں شیخ محمد عبداللہ کی معزولی کے بعد یہ دو گروہ نیشنل کانفرنس میں نمایاں طور پر اپنے اپنے رنگ میں نمودار ہونے لگے۔ ایک گروہ صادق صاحب کی رہنمائی میں خاص سمت کی طرف گامزن تھا تو دوسرا گروہ بخشی صاحب کی قیادت میں کسی ٹھوس سیاسی نظریہ کے بغیر رواں دواں تھا اس لئے ابتداء میں ہی یہ خیال کرنا بعید از امکان نہیں تھا کہ ان دو گروہوں میں کسی بھی وقت شدید اختلافات پیدا ہو جائیں گے۔ یہ اختلافات سنہ ۱۹۵۶ء میں ایک خاص سطح پر آ گئے۔ ریاستی حکومت نے پہلی بار جشن کشمیر منانے کا فیصلہ کیا۔ صادق گروپ سے تعلق رکھنے والے وزیروں نے ان تقریبات میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ یہ دونوں دھڑے حکومت اور حکمران جماعت نیشنل کانفرنس میں ایک دوسرے پر بالادستی حاصل کرنے کے متمنی تھے۔ اس لئے اسی خیال کے زیر اثر دونوں دھڑے حکومت اور نیشنل کانفرنس میں اپنے اپنے آدمیوں کو آگے بڑھانے کی اور حریف دھڑے کو پچھاڑنے کی کوشش کرتے رہے۔ شروع میں صادق گروپ نے حکومت اور حکمران جماعت کے غیر جمہوری اعمالوں کی وجہ سے عوام میں جذبۂ نفرت پیدا ہونے پر اور نیشنل کانفرنس کو کسی حد تک جمہوری رنگ و روپ عطا کرنے کی مساعی کرتے رہے۔

شیخ صاحب کی وزارت عظمیٰ سے برطرفی کے بعد ستمبر سنہ ۱۹۵۳ء میں نیشنل کانفرنس کا جو کنونشن سرینگر میں منعقد ہوا تھا اس میں انتظامیہ، مشینری اور نیشنل کانفرنس کے نقائص کا جائزہ لیا گیا اور آئندہ سے عوام اور ملک کی بھلائی کو مقدم تصور کر کے ان خامیوں کا قلع قمع کرنے کا حلف لیا گیا تھا لیکن یہ سب کچھ صدا بصحرا معلوم ہوا۔ تنظیمی خامیوں کی وجوہات کے بارے میں کنونشن میں یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ تنظیم میں غیر جمہوری طریقہ کار فرما ہے اور دھڑہ بندی

پیدا ہوگئی ہے۔ کوئی ایک لیڈرشپ قائم نہیں رہ سکی شخص پرستی کی وجہ سے
ایک ہی تنظیم کے ارکان مختلف شخصوں کو اپنا لیڈر تصور کرکے پارٹی کے اصولوں سے
انحراف کرنے لگے ہیں۔ اس طرح سے تنظیم کے اندر ہی اندر سیاسی رقابت بڑھتی گئی۔ مذکورہ
کنونشن میں نیشنل کانفرنس کو ایک جمہوری اور منظم جماعت بنا کر عوام کے قریب تر
لائے جانے کا فیصلہ لیا گیا تھا لیکن یہ سب کچھ کاغذی تھا اور صرف ظاہرداری
کے طور پر کیا گیا، تنظیم میں دوبارہ تنزل کے آثار نمایاں ہوگئے اور انتشاری کیفیت
پھیلتی گئی۔ صادق گروپ نے ان حالات کی طرف بخشی گروپ کی توجہ دلانے کی
کوشش کی۔ نیشنل کانفرنس سے علیحدہ ہونے سے پہلے جموں کے کئی نیشنل کانفرنسی ممبران
اسمبلی نے حکومت اور تنظیم میں جمہوری نقطہ نگاہ کے مطابق اصلاح کرنے کی مانگ کی تھی
اور اس بارے میں انہوں نے پہلے ہی ریاستی وزیر اعظم کی خدمت میں ایک یادداشت
بھی پیش کی تھی۔ مئی سنہ ۱۹۵۶ء میں صادق صاحب نے بھی نیشنل کانفرنس کی ورکنگ
کمیٹی میں اس مطلب کا ایک نوٹ پیش کیا تھا کہ حکومت میں فسطائی رجحان
ختم کرکے نیشنل کانفرنس میں جمہوری طریقہ کار کو اپنایا جائے۔ آپ نے اس نوٹ میں
ظاہر کیا تھا "دیکھنا یہ ہے کہ تنظیم اور حکومت کی موجودہ حالت ایسی ہے، جسے
ہم اطمینان بخش کہہ سکتے ہیں؟ کیا ہماری تنظیم اس وقت اس قابل ہے کہ
وہ کامیابی کے ساتھ اپنا رول ادا کرسکے؟ افسوس کے ساتھ اس امر کا اعتراف
کرنا پڑتا ہے کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ اس لئے کہ ہم نے ان فیصلوں پر
تندہی کے ساتھ پوری طرح عمل نہیں کیا جو ہم نے ستمبر سنہ ۱۹۵۳ء کی کنونشن میں کئے تھے اور جن
کا اعادہ ہم نے سنہ ۱۹۵۴ء کی سالانہ کانفرنس میں کیا تھا" چنانچہ اس وقت بھی صادق صاحب نے
ورکنگ کمیٹی کی توجہ نیشنل کانفرنس میں موجود دھڑہ بندی کی طرف دلائی تھی۔ آپ نے لکھا تھا
"تنظیم کی حالت اس وقت کیا ہے؟ مختلف علاقوں سے جو اطلاعات
آتی رہتی ہیں۔ ان کے مطابق ہر جگہ گٹھ بندی، باہمی کشیدگی اور اس قسم کی دیگر
سنگین خرابیاں روز بروز بڑھتی جارہی ہیں۔ آمرانہ اور غیر جمہوری رجحانات
نے پھر سے بری طرح سر اٹھایا ہے۔ کئی تنظیمی کمیٹیاں ضابطہ اور آئین کی پرواہ
نہ کرتے ہوئے توڑ دی گئی ہیں۔ بددیانت عناصر تنظیم کے اندر گھسنے میں

کامیاب ہو گئے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بہت سے کارکن ٹھیکیداریوں اور جائز و ناجائز طریقوں سے پیسہ کمانے میں لگے ہیں[1]

اس کے بعد مسٹر ڈی، پی، دھر نے بھی ورکنگ کمیٹی کے سامنے تنظیم میں اصلاح کر کے سُتھرا پن لانے کیلئے ایک قرارداد رکھی لیکن نیشنل کانفرنس کی لیڈرشپ نے اس کو ٹال دیا۔ جن قراردادوں میں نکتہ چینی اور تنقید ہوا کرتی تھی انکو پس پشت ڈالا جاتا تھا اور صرف تعریفی قراردادوں کو ہی پیش ہونے کا موقع دیکر منظور کیا جاتا تھا۔ متعدد بار مطالبہ کئے جانیکے باوجود بھی ورکنگ کمیٹی یا جنرل کونسل کی میٹنگ نہیں بلائی جاتی اسی سلسلے میں ڈی، پی۔ صاحب کی قرارداد میں درج تھا۔

" ورکنگ کمیٹی افسوس ظاہر کرتی ہے کہ ماضی میں کمیٹی کی میٹنگیں منعقد کرنے کی طرف کافی توجہ نہیں دی گئی، نتیجہ کے طور پر جنرل کونسل کی سنہ ۱۹۵۲ء سے سے صرف ایک میٹنگ ہوئی ہے۔ اس طرح مشورہ حاصل کرنے کے اصول کو نظر انداز کیا گیا۔ خاص کر مجلس قانون ساز کے امیدواروں کے انتخاب کے موقع پر اور عام چناؤ کے بعد حکومت کی پالیسی مرتب کرنے کے موقع پر کئی جگہوں پر گٹھ بندی کی بنیادوں پر تنظیم کے کام کو معطل کرنے کی کوششیں کیگئیں ۔۔۔۔۔۔۔ ورکنگ کمیٹی اس امر کو بہت تشویش کی نگاہ سے دیکھتی ہے کہ تنظیم کے کچھ کارکن ایڈمنسٹریشن میں دخل انداز ہوئے ہیں جس کا یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ کچھ سرکاری ملازموں کو تنظیم کے کاموں میں مخل ہونے کا موقع ملتا ہے۔ یہ اشارے اس شدید بیماری کی طرف اشارہ کرتے ہیں جسکو اگر بروقت دُور نہ کیا گیا تو تنظیم جنتا سے الگ ہو جائے گی[2]

ایک طرف یہ خیال تھا تو دوسری طرف سے تنظیم کے صاحب اختیار گروہ کا طریقہ یہ تھا کہ دھمکی دیکر، لالچ اور رشوت دیکر پیس برگیڈ اور اسپیشل اسٹاف کی مدد سے سیاسی اور انتظامی کاروبار چلایا جائے اور یہ گروہ مخالفوں کو پیس برگیڈ کے ڈنڈوں سے قابل کرنے سے بھی نہیں جھجکتا تھا

"نیشنل کانفرنس کا صاحب اقتدار حلقہ بحث و مباحثہ اور تبادلہ خیال کے ذریعہ جمہوری فضا پیدا کرنے کا قائل نہیں، وہ اسپیشل اسٹاف اور "ہش مش" کے ذریعہ لوگوں کا منہ بند کرنا چاہتا تھا۔ نیشنل کانفرنس کا صاحب اقتدار حلقہ پرخلوص

---

[1] اخبار کشمیر اکتوبر ۱۹۵۷ء کنونشن نمبر [2] اخبار کشمیر کنونشن نمبر

اور ایسا نڈار اور باشعور کارکنوں کو ناپسند کرتا تھا کیونکہ وہ خود دار ہوتے ہیں اور ہر قسم کی بدعنوانی پر تنقید کرتے ہیں۔ صاحب اقتدار حلقہ ان کارکنوں کی حوصلہ افزائی کرتا تھا جو خوشامدی ہوں، خریدے جاسکیں اور عوام پر دھونس جماکر انہیں حاکم وقت کا غلام بنائیں۔[۵۱]

جب دو دھڑوں کی کشمکش بڑھتی گئی تو بخشی گروپ نے صادق گروپ کو تنظیم سے علیحدہ کرنے کے بہانے ڈھونڈے۔ نتیجہ کے طور پر مؤخرالذکر گروپ سے وابستہ کارکنوں کو تنظیم کے عہدوں سے الگ کرنے کی مہم تیز ہوگئی، جموں ڈسٹرکٹ نیشنل کانفرنس کمیٹی کے صدر کے خلاف کچھ ڈیلی گیٹ جمع کراکے عدم اعتماد کا ووٹ پاس کرایا گیا۔ اسی طرح صدر ضلع ادھمپور کے خلاف بھی عدم اعتماد کی قرارداد پاس کی گئی۔ جموں سٹی کمیٹی کو توڑ دیا۔ کولگام تحصیل کمیٹی کے صدر کو علیحدہ کیا گیا " سوپور کی حلقہ کمیٹی کی ازسرِ نو تنظیم کی گئی۔ اس لئے کہ یہ لوگ پیس بریگیڈ کی سرگرمیوں پر تنقید کرتے تھے۔ کولگام میں پیس بریگیڈ کے کمانڈر کو الگ کیا گیا کیوں کہ وہ مارپیٹ کے خلاف تھا۔ جموں کی شہر اور ضلع کمیٹیوں میں ردوبدل کیا گیا کیونکہ وہاں جنرل سیکرٹری کے مخصوص طریقۂ کار کو ناپسند کیا جاتا تھا"[۵۲]

سنہ ۱۹۵۳ء میں نیشنل کانفرنس اور حکومت کی جو نئی تشکیل ہوگئی، اس میں دو نظریہ رکھنے والے گروہوں کا اشتراک عمل ہوا تھا اس بارے میں اس وقت کے کمیونسٹ اخبار اور ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کے ترجمان اخبار کشمیر میں مزید درج ہے۔ " سنہ ۱۹۵۳ء کے وزارتی تغیر کے بعد جو نیا تنظیمی ڈھانچہ بنا، وہ اصل میں بنیادی مسائل پر ایک نظریہ رکھنے والے مگر طریقۂ کار پر دو زاویۂ نگاہ رکھنے والے عناصر کا متحدہ محاذ تھا......... دونوں رجحانات کو سمیٹنے کیلئے اور اتحاد پیدا کرنے کیلئے اس وقت صادق بخشی اجتماعی قیادت قائم ہوئی"

حق تو یہ ہے کہ نیشنل کانفرنس کا باشعور اور سنجیدہ طبقہ خواجہ غلام محمد صادق کے ساتھ تھا۔ بالائی سطح پر تنظیم میں کوئی واحد اور مضبوط جمہوری پرولیڈر شپ نہیں تھی بلکہ یہ صادق اور بخشی صاحب میں بٹی ہوئی تھی۔ " جو بھی ہے کہ واقعات رونما ہو رہے ہیں ان سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ خرابی کہیں اور ہی ہے

---

۵۱ اخبار کشمیر "کنونشن نمبر" ۵۲ اخبار کشمیر "کنونشن نمبر"

سنٹری غلام محمد بخشی کو اکثریت کا وہ اعتماد حاصل نہیں جس کا وہ دعویٰ کر رہے ہیں۔ کانفرنس کا اعتماد بخشی اور صادق میں مشترک تھا۔ ان کی ایک راہ نہ رہی تو اعتماد بھی متزلزل ہو گیا" [۱]

اس طرح سے نیشنل کانفرنس کے اندر دو گروہ اقتدار کی رسہ کشی میں ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہو گئے۔ یہ بات پہلے ہی بیان کی گئی ہے کہ بخشی گروپ نے صادق صاحب اور ان کے کچھ خاص رفقاء کو انتخابی عذر داری سے کس طرح گرانے کی کوشش کی۔ اس وقت کے اسمبلی سپیکر مسٹر غلام رسول رینزو کو اسی وجہ سے اسمبلی کے انتخاب میں بخشی گروپ کی حمایت حاصل نہیں رہی۔ نیشنل کانفرنس کے امیدوار ہونے کے باوجود بھی نیشنل کانفرنس کا صاحب اقتدار حلقہ انہیں شکست دینے میں کامیاب ہو گیا۔

" مسٹر غلام رسول رینزو کی شکست نیشنل کانفرنس کے ایک خاص گروہ کی منظم سازش کا نتیجہ ہے اور حقیقت میں اس گروہ نے نیشنل کانفرنس کی بیٹھ میں چھرا گھونپا۔ انتخابات سے نیشنل کانفرنس کی تنظیم کو عوام میں اپنی یک جہتی دکھانے اور اپنا وقار قائم رکھنے کا موقعہ حاصل ہوا تھا۔ مگر نظم و ضبط اور ڈسپلن کے مسلّمہ اصولوں کے برخلاف نیشنل کانفرنس کے اندر کسی اصحاب نے تنظیم اور اس کے نصب العین کو شرارت انگیزی کے ذریعہ خراب کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس سے انتشار کا ایک افسوسناک عمل شروع ہوا" [۲]

صادق صاحب نے تشویش ناک امور کی طرف بخشی صاحب کی توجہ دلا دی لیکن موخر الذکر اس سے مس نہیں ہوئے۔ بخشی صاحب کی ذمہ داری دوگنی تھی کیونکہ وہ ریاست کے پرائم منسٹر بھی تھے اور نیشنل کانفرنس کے صدر بھی۔ اس لئے صادق صاحب ان سے تنظیم میں موجود انتشار پرست عناصر کی سرکوبی کرنے کا واویلا کرتے رہے۔

" میں نے پہلے بھی کئی مواقع پر آپ سے ان امور کا ذکر کیا ہے جو سٹر

---

[۱] اخبار " تیج " دہلی مورخہ ۲۱ اگست ۱۹۵۷ء

[۲] صادق کا خط بخشی کے نام (صادق بخشی خط و کتابت) صفحہ نمبر ۱۸، ۱۹

رہنماؤں کے انتخاب کے دوران اور اس کے بعد بھی میں نے آپ کو (بخشی صاحب) خبردار کیا۔ صرف چند ایسے اشخاص کو جنہیں تنظیم میں انتشار پھیلانے کے سلسلے میں محض آلہ کار بنایا گیا، سزا دینا کافی نہیں۔ اگر اس عمل کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا ہے اور اس خرابی کو روکنا ہے تو ایسے تمام اشخاص کے خلاف کارروائی کرنا ضروری تھا اور اب بھی ہے جو اس انتشار کو منظم کرنے اور پھیلانے کے ذمہ دار ہیں" ۵۱

صادق گروپ کی برسر اقتدار ٹولہ کے سامنے کوئی پیش نہیں چلتی اور وہ مایوسی کے عالم میں دامن اقتدار کو بھامے رہنے پر اکتفا کرتے۔ صادق صاحب نے اپنی بے بسی کا بخشی صاحب سے گلہ ان الفاظ میں کیا۔

"میں نے اس صورت میں بھی جبکہ میں آپ کے فیصلوں یا خیالات سے اتفاق نہ کر سکتا تھا ان کو اسلئے تسلیم کیا ہے تاکہ ٹیم میں اتحاد قائم رہے جو اس کے لئے ضروری ہوتا ہے مگر یہ آپ کے ساتھ ناانصافی ہوگی اگر میں آپ کو یہ صاف صاف نہ بتا دوں کہ جب بھی مشترکہ صلاح و مشورہ کے اصول کو نظر انداز کیا گیا تو نتائج کچھ زیادہ تسلی بخش نہیں رہے ہیں" ۵۲

اسمبلی چناؤ کے سلسلے میں حکمران جماعت کے ممبران کے انتخاب کے لئے اگر مجموعی طور اور تنظیمی سطح پر کوئی فیصلہ لیا جاتا اور ممبران کے انتخاب کے لئے کوئی معیار مقرر کیا جاتا تو ایسے فیصلوں کی دھجیاں بعد میں اڑائی جاتیں اور صادق صاحب اور ان کے ساتھی بجز خاموشی کے اُف تک نہ کر سکتے اور برسر اقتدار ٹولہ کی غیر جمہوری حرکات کو خاموشی سے برداشت کر لیتے۔ اس صورت حال پر صادق صاحب نے یوں اپنے احساس کی محکمی کا بھرپور اظہار کیا ہے۔

"یہاں اس بات کا اعادہ کرنا مناسب ہوگا۔ کہ جب نیشنل کانفرنس الیکشن بورڈ نے قانون ساز اسمبلی کے انتخابات کے لئے کانفرنس کے امیدواروں کے طور پر مختلف ناموں کو چن لینے کی غرض سے انہیں زیر بحث لایا تو میں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ غیر مذہبی جمہوریت کے اصول اور ہندوستان

---

۵۱ صادق بخشی خط و کتابت صفحہ ۲۴ ۔۔ ۵۲ صادق بخشی خط و کتابت صفحہ ۳۰

کے ساتھ ہمارے رشتہ سے وفاداری ہی اس چناؤ کی کسوٹی ہونے چاہئیں اس لحاظ سے میں موجودہ قانون ساز یہ کے ایسے ممبروں کی شمولیت پر جو محاذ رائے شماری میں شامل ہو گئے تھے خوش نہیں ہوا۔ لیکن پھر بھی میں نے اس معاملے میں آپ کی خواہشات کے سامنے سر تسلیم خم کیا........ اسی بحث و مباحثہ کے دوران آپ نے اور ورکنگ کمیٹی کے تمام دوسرے ساتھیوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ مسٹر عبدالغنی گونی کو جو کچھ عرصہ پہلے محاذ رائے شماری کے نائب صدر تھے۔ نیشنل کانفرنس کا ٹکٹ دینا غلط ہوگا۔ آپ نے اس معاملہ پر مجھ سے دوبارہ بات چیت کی اور ہم نے اس بارے میں اپنے سابقہ فیصلہ پر قائم رہنے پر اتفاق کیا اور اسی کی بجائے مسٹر محمد انور کو امیدوار چنا گیا......... مگر بعد میں اس فیصلہ کو میرے اور آپ کے دوسرے رفقائے کار کے علم کے بغیر ہی بدل دیا گیا۔ یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ اس سے مجھے سخت دکھ ہوا مگر تنظیم میں اتحاد و اتفاق کے کاز کو تقویت دینے کے عہد کے پیش نظر میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا" ؎۱

اسمبلی انتخاب میں شکست کھانے کے بعد رہنبر و صاحب کو صادق صاحب لیجسلیٹو کونسل کی ممبری کے لئے نیشنل کانفرنس کا منڈیٹ دلانا چاہتے تھے لیکن بخشی صاحب نے کانگریس کی ہدایت کا حوالہ دیکر شکست خوردہ آدمی کو کونسل کی ممبری کیلئے منڈیٹ دینے سے انکار کیا۔ تب اپنے لئے اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر صادق صاحب کشمیر کے مخصوص حالات کا واسطہ بخشی صاحب کو دینے لگے

" کانگریس کی اس عام ہدایت کا اطلاق کرتے وقت ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہئیے کہ کہیں ہم اپنے مخصوص حالات کو بھول نہ جائیں اور اپنے کچھ آزمودہ اور تجربہ کار کارکنوں کو خاص کر جو مسلمان ہوں مواقع سے محروم نہ کریں" ؎۲

ستم ظریفی دیکھئے کہ صادق صاحب نے اپنی وزارت کے دوران گونی صاحب کو وزیر کے جلیل القدر عہدہ سے سرفراز کیا اور صادق صاحب کے بعد اب قاسم صاحب نے بھی گونی صاحب کو کرسی وزارت پر جلوہ افروز کیا۔

؎۱ صادق بخشی خط و کتابت صفحہ ۲۱۔ ؎۲ صادق کا خط بخشی کے نام مورخہ ۱۲ جولائی ۱۹۵۷ء

دو گروہوں کے درمیان اختلافات کی خلیج پاٹی نہ جا سکی، مصالحت بے اثر ثابت ہوئی اور بخشی صاحب سے صادق صاحب اپنی ۲۵ جولائی ۱۹۵۷ء کی چھٹی میں یوں مخاطب ہو گئے۔ "آپ نے اپنے خطوط میں جس نقطۂ نظر کو اپنا نا مناسب سمجھا اس کی نسبت میرا یہ ردِّ عمل تھا کہ آپ کو مسایل کی شدید نوعیت کا اس حد تک اندازہ نہیں جتنا کہ مجھے توقع تھی۔ جب میں نے کل کی بات چیت کے دوران آپ کو ان اہم مسایل کے حل کرنے کی فوری ضرورت کا احساس دلانے کی کوشش کی تو میرے اس خیال کی تصدیق ہو گئی کہ آپ ان مسایل کی نسبت سہل انگاری کا رویہ اختیار کرتے رہے ہیں" ۱ـ

بالآخر صادق گروپ ۱۹۵۷ء میں نیشنل کانفرنس سے علیحدہ ہو گیا اور نئی تنظیم ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کی صادق صاحب کی صدارت میں تشکیل کی گئی۔ اس کے بعد اس تنظیم کے سربراہ صادق صاحب اور دوسرے رہنماؤں نے وادی کشمیر کا دورہ شروع کر کے جا بجا تقریریں کرنے کی کوشش کی لیکن ان کے جلسوں میں بار بار ہلڑ بازی کی گئی اور کچھ علاقوں میں دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری نافذ کر دیا گیا۔

"علیحدگی کے بعد جس غلطی سے مسٹر صادق بچ گئے تھے وہی مسٹر بخشی سے سرزد ہو گئی۔ مسٹر صادق کی علیحدگی کو جمہوری اقدام نہ سمجھ کر اسے غالباً ذاتی مخالفت سمجھا اور عناد کی شکل دینے کو تیار ہو گئے ورنہ کیا معنی کہ جس میٹنگ میں مسٹر صادق تقریر کرنا چاہتے تھے اس پر لاٹھی چارج کر کے اسے منتشر کر دیا گیا۔ مسٹر غلام محمد بخشی اگر آپے سے باہر نہ ہو کر ہوش سے کام لیتے تو کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونی چاہئے تھی"۔ ۲ـ

خواجہ غلام محمد صادق خواجہ سید میر قاسم، پنڈت ڈی، پی در اور مسٹر گردھاری لال ڈوگرہ کے نیشنل کانفرنس سے علیحدہ ہونے پر پڑھے لکھے، قابل اور نسبتاً باشعور کارکن اس تنظیم کو چھوڑ کر ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس میں شامل ہو گئے۔ اگر پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہند، دت پر سرینگر آ کر بخشی صاحب کی اعلانیہ حمایت نہیں کرتے تو بخشی صاحب کی نیشنل کانفرنس بالکل کھوکھلی بن گئی ہوتی۔ اس دور میں جموں و کشمیر کے باشعور سیاسی کارکنوں اور دانشوروں کی غالب اکثریت

۱ـ صادق بخشی خط و کتابت صفحہ ۵۔ ۲ـ اخبار "تیج" دہلی مورخہ ۲۱ اگست ۱۹۵۷ء

صادق صاحب کی گرویدہ تھی اور انہیں ان کی مکمل پشت پناہی اور اعتماد حاصل تھا لیکن کچھ عرصہ بعد جب سنہ ۱۹۶۰ء میں صادق صاحب اور ان کے ساتھی سیاسی جدوجہد سے اکتا کر عوام سے بے اعتنائی برت گئے اور بڑی ڈھٹائی سے دوبارہ بخشی صاحب کے ساتھ شریک اقتدار ہو گئے تو لوگ ان سے بہت بیزار ہو گئے اور ان کی موقع پرستی سیاسی بددیانتی اور کم حوصلگی پر چار آنسو بہا بیٹھے۔ جس بخشی صاحب اور ان کے حواریوں کے خلاف صادق صاحب اور ان کے ساتھی دن رات سنگین الزامات دہرانے سے نہیں تھکتے تھے، اور نیشنل کانفرنس میں واپس جانے کے سوال کو خارج از امکان قرار دیتے اسی بخشی صاحب کو انہوں نے چشم زدن میں دوبارہ اپنا ناخدا تسلیم کر لیا اور عوام کی نظریں چرا کر وزارت کی کرسیوں پر شرمساری کے عالم میں دوبارہ براجمان ہو گئے۔ آپسی طعنہ زنی، عیوب زدگی اور الزام تراشی یکسر ختم ہو گئی جیسے یہ سارے اعلیٰ کردار کے حامل اور پارسا ہوں۔

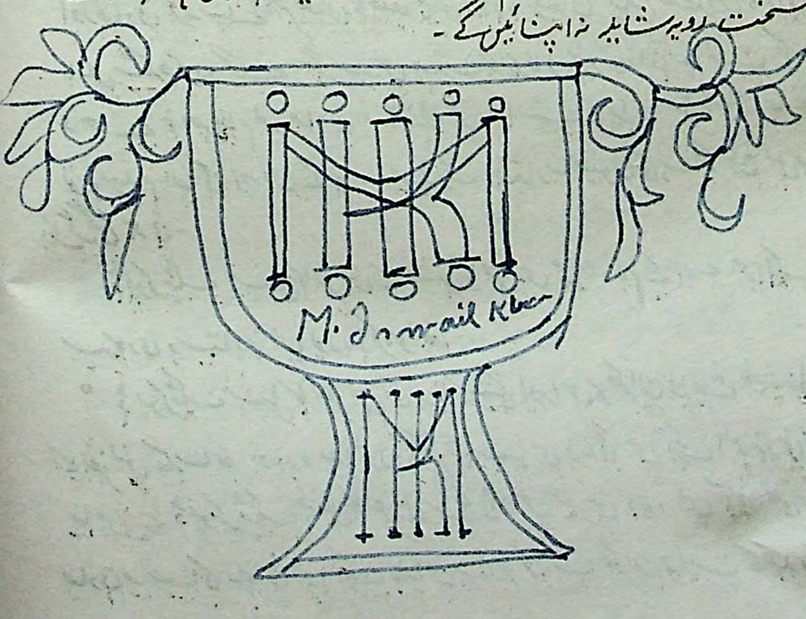
اس سیاسی شعبدہ گری سے جہاں ریاست جموں و کشمیر میں جمہوری تحریک کے پنپنے کے مواقع کم رہے وہاں لوگوں کا اعتماد یہاں کے لیڈروں پر سے ختم ہو گیا اور صادق گروپ کے معترضوں کا حلقہ کہیں زیادہ بڑھ گیا لیکن معتقدوں کا دائرہ بالکل سکڑ کر رہ گیا ہے۔ اگر بعد میں پنڈت جواہر لال نہرو کی ذاتی مداخلت کی وجہ سے خواجہ غلام محمد صادق سنہ ۱۹۶۴ء میں ریاست کے پرائم منسٹر نہ بنائے جاتے تو نہ معلوم ان کا اور ان کے پرانے شریک اقتدار ساتھیوں کی ساکھ آج کس حد تک گر گئی ہوتی۔

ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کے نیشنل کانفرنس میں ادغام کے بارے میں ایک سرکاری دستاویز میں یوں ذکر ہوا تھا۔

"ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کی برخاستگی اور اس کا حکمران جماعت نیشنل کانفرنس کے ساتھ دوبارہ ملنا جموں و کشمیر کی سیاسی زندگی میں ایک اہم تبدیلی کا ضامن ہے۔ ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس سنہ ۱۹۵۷ء میں معرض وجود میں آئی تھی جبکہ صادق صاحب کی رہنمائی میں ایک ناراض شدہ گروپ حکمران جماعت کے صدر

بخشی غلام محمد اور مسٹر صادق کے درمیان اختلافات ہونے کی وجہ سے نیشنل کانفرنس سے علیحدہ ہوگیا۔ اختلافات سرکار کے اقتصادی پروگرام اور دوسری پالیسیوں کو روبہ عمل لانے کے سلسلے میں نمودار ہوئے، گزشتہ تین سالوں کے واقعات نے ان دو لیڈروں کو معمولی شان کی باتیں اور جماعتی اختلافات کو بھول کر اکٹھا ہونے پر مجبور کیا، دونوں نے سرحد پار کے خطرات کا مشترکہ طور مقابلہ کرنے کیلئے آپس میں ملنے کا فیصلہ کیا۔ حکمران جماعت اور ناراض شدہ گروپ کے درمیان سیاسی اعتقاد کی بنا پر کوئی اختلاف رائے نہیں تھا۔

وزیر اعظم بننے کے بعد خواجہ صادق نے نیشنل کانفرنس کو انڈین نیشنل کانگریس میں تبدیل کیا اب بخشی صاحب نے بھی نیشنل کانفرنس کو کانگریس میں شامل ہونیکا فتویٰ دیدیا۔ دیکھنا باقی ہے کہ صادق صاحب کی وفات کے بعد اب کانگریس کے نئے وزیر اعلیٰ مسٹر میر قاسم اور بخشی صاحب کیا سیاسی آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔ اگرچہ صادق صاحب نے بخشی صاحب کا کانگریس میں شامل ہونا مشکل بنا دیا تھا۔ لیکن قاسم صاحب کے بارے میں عام خیال ہے کہ وہ اتنا سخت رویہ شاید نہ اپنائیں گے۔



موئے مقدس کا سانحہ

وادی کشمیر میں ایک بہت بڑی اور مشہور زیارت گاہ حضرت بل ہے یہ زیارت مشہور مغل باغ نسیم کے پہلو اور جھیل ڈل کے کنارے موجود ہے حضرت بل نامی قصبہ بھی جھیل ڈل کے کنارے آباد ہے جو سرینگر سے کوئی چھ میل کے فاصلے پر ہے۔ کئی سالوں سے اب کشمیر یونیورسٹی بھی اسکے پاس ہی ہے اور ایک بڑا احاطہ اپنے گھیرے میں لئے ہوئی ہے، آثار شریف حضرت بل میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مقدس محفوظ ہے۔ کہا جاتا ہے شہنشاہ اورنگزیب کے زمانے میں اسکو کشمیر میں لایا گیا اور مسجد شریف حضرت بل میں جلوہ افروز کرایا گیا، مسٹر شیخ محمد عبداللہ نے اس آستان کی آرایش و وسعت کی طرف ہمیشہ خاص توجہ دی ہے اور اسے ایک عمدہ زیارت گاہ بنا یا ہے۔ سال میں کل چار تہواروں پر موئے مقدس کی زیارت کا شرف اہل اسلام کو حاصل ہوتا ہے۔ اہل سنت اہل التشیع سے بھی کہیں زیادہ اس زیارت گاہ کو اہم، مقدس اور متبرک سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ زیارت گاہ محض عقیدت گاہ ہی نہیں ہے بلکہ سیاست گاہ بھی ہے اور خاص کر مسٹر شیخ محمد عبداللہ اور ان کے حامیوں کا سیاسی پلیٹ فارم بھی۔ اور اسی پلیٹ فارم سے "کشمیر چھوڑ دو" تحریک کے دوران، نیشنل کانفرنس کے والنٹیر ہر جمعہ کو مہاراجہ ہری سنگھ کے خلاف تقریر کر کے گرفتار ہونے کے لئے پیش ہو جاتے تھے۔ اب بھی بوقت ضرورت جمعہ کے روز اس مذہبی ممبر سے سیاسی وعظ خوانی ہوتی ہے۔ غالباً یہ بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے کہ پڑوس میں قائم "ریجنل انجینئرنگ کالج" میں پچھلے کئی سالوں سے عموماً سیاسی قسم کی ہلڑ بازی ہوتی رہی ہے اور جس سے کئی بار حالات بڑے پیمانے پر بگڑنے کا شدید احتمال رہا ہے۔

موئے مقدس بہت احتیاط اور حفاظت کے ساتھ انتظامیہ کمیٹی کے ذمہ دار اراکین کے زیر تحویل وزیر نگرانی اس زیارتگاہ کے مخصوص کمرے کی مخصوص جگہ پر زینت افروز ہوتا ہے جہاں تحویل داروں کے بغیر رسائی ممکن نہیں ہے لیکن اس کے باوجود آثار شریف حضرت بل سے موئے مقدس کی ۲۶ دسمبر ۱۹۶۳ کو پر اسرار گمشدگی وادی کشمیر کے تمام لوگوں کی حیرانی اور تعجب کا باعث بنی یہ خبر اچانک طور صبح سویرے سارے شہر میں آن واحد میں پھیل گئی اور چٹکیوں میں ساری وادی میں ایک ہیجان بپا ہوگیا اور سراسیمگی طاری ہوگئی۔ کچھ لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات ابھر آرہے لیکن سبھوں کے دلوں میں موئے مقدس کے تئیں والہانہ عقیدت اور جذبات کے چشمے ابل پڑے۔ کیا مسلم کیا غیر مسلم! ہر کوئی اظہار عقیدت کرنے لگا۔ ہر کوئی واویلا اور احتجاج کرنے لگا کہ "واپس کرو اے ظالمو موئے مقدس پاک کو" اتنی حفاظت کے باوجود بھی یہ صدیوں کے بعد گم ہوا تو کیسے؟ موضوع سخن ایک لیکن الزام اور استدلال مختلف۔ اندیشوں کے گھناونے سائے تلے اس قابل مذمت حرکت کو نہ کسی اہل ہنود کے مذہبی جنون کا شاخسانہ قرار دیا گیا اور نہ ہی اس کے لئے حکومت کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا عوامی چہ میگوئیاں جاری رہیں احتجاج بڑھتا گیا واویلا ہوتے رہے اور لوگوں کا ایک سمندر پھوٹ پڑا اور آہ و فریاد کی وسعتیں بیکراں ہوگئیں۔ شہر سرینگر میں ہر جگہ جلسے ہوئے بھاری جلوس نکلے دوکانیں لگاتار بند رہیں لیکن کئی روز تک نہ ہی موئے مقدس کی دستیابی کا کچھ پتہ چلا اور نہ ہی ملزموں کا کوئی سراغ ملا دیہاتوں سے جلوس کی صورت میں روزانہ ہزاروں آدمی آہ وزاری و فریاد کرکے سرینگر آتے رہے۔ یہاں ان کے ٹھہرنے کا انتظام تمام مسجدوں میں کیا گیا۔ سڑکوں پر لنگر لگائے گئے اور ان کے کھانے پینے کا بندوبست کیا گیا۔ حکومت کی طرف سے نہیں کسی خاص انجمن کی طرف سے بھی نہیں بلکہ عوام نے رضاکارانہ اور عقیدت مندانہ جذبے سے۔

۔ یہ عوامی یلغار کسی بھی وقت کوئی بھی صورت اور رُخ اختیار کرسکتی اس وسیع اور شدید تحریک کو خاص سمت پر لگانے کی ابتدا ہی میں کچھ کوششیں ہوئیں۔ چند اصحاب نے بھانپ لیا کر وادی کشمیر میں اہل اسلام غم و غصہ پر اُتر آئے ہیں اور کہیں کسی سازش یا نافہمی کی وجہ سے یہ غلط رُخ اختیار نہ کرے اور کہیں اہلِ ہنود پر اس کا نزلہ نہ گرے۔ کشمیر پولیٹکل کانفرنس بانی صدر خواجہ غلام محی الدین قرہ نے لال چوک سرینگر میں تقریر کرتے ہوئے ابتدا میں ہی جہاں ہندو مسلم اتحاد قایم رکھنے کی تلقین کی وہاں اس بدترین فعل کی سرزدگی کو بخشی گروپ سے منسوب کیا۔ ان دنوں اگرچہ بخشی غلام محمد وزارت عظمیٰ سے علیحدہ کئے گئے تھے اور مسٹر شمس الدین ان کے جانشین بنے تھے لیکن پردے کے پیچھے تار ہلانے والا بخشی صاحب کو ہی تصور کیا جاتا تھا تب حکمران جماعت نیشنل کانفرنس بخشی گروپ کے ہی زیر اثر تھی اسلئے کئی سیاسی افراد اور کارکنوں کو گرفتار کر کے جیل بھیجدیا گیا جن میں خواجہ غلام محی الدین قرہ اور شری محمد شفیع قریشی وغیرہ شامل تھے۔ اگر مرکزی سرکار کی مداخلت سے جلد ہی عنان حکومت خواجہ غلام محمد صادق کے ہاتھ میں منتقل نہیں ہوجاتی تو کہا نہیں جاسکتا کہ گرفتار شدہ لوگوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جاتا یہ تحریک ایک سیاسی اور عوامی ابھار کی بھی نشاندہی کرتی تھی۔ اس کے محرک یا تو ابتدا سے ہی سیاسی مقصد حاصل کرنے کی نیت رکھتے تھے یا ان کی توقع کے خلاف بعد میں اس کا سیاسی ردعمل ہوا۔

حکمران جماعت نیشنل کانفرنس کے جنرل سیکرٹری بخشی عبدالرشید معمول کے انداز میں اپنی سنان گستری کے ساتھ اس عوامی ابھار کو ختم کرنے کی کوشش میں سربازار آئے تو بے قابو عوام کے جنگل میں پھنس کر ان کے قہر و غضب کا شکار ہوگئے اور بڑی مشکل سے خلاصی پاکر لال چوک کے ایک ہوٹل میں چھپ گئے اور لوگ ان کی جیپ نذر آتش کر گئے۔ اصل میں اسی دن سے بخشی گروپ نے اقتدار سے پورے طور پر ہاتھ دھو لئے۔

ایک مکتب خیال یہ بھی ہے کہ موئے مقدس کی چوری کرنا یا اس کی

گمشدگی کا بہانہ بنانا اصل میں کشمیر کے خوابیدہ لوگوں کو جھنجوڑنے اور ابھرنے کا موقع فراہم کرنا تھا تاکہ بخشی گروپ کو سیاسی طور پر ختم کرکے جیلوں میں بند پڑے لیڈروں، شیخ محمد عبداللہ، مرزا محمد افضل بیگ وغیرہ کو رہا کرانے کیلئے دباؤ ڈالا جاسکتا، حقیقت میں موئے مقدس کی گمشدگی کا راز کیا تھا اور سازش کیسی اور کس کی تھی اس پہ سے آج تک پردہ اٹھ نہیں سکا۔

موئے مقدس کی گمشدگی کے دن بخشی غلام محمد دھلی میں تھے، جوں ہی انہیں اس سانحہ کے متعلق علمیت ہوئی تو انہوں نے سرینگر میں اپنے آدمیوں کو ٹیلی فون پر ہدایت کی کہ وہ فوراً میدان میں آکر ڈٹ جائیں اور کسی کو میدان مارنے کا موقع نہ دیں لیکن بخشی عبدالرشید کے بعد کسی نیشنل کانفرنسی کو میدان میں آنے کی ہمت نہ رہی، بعد میں جب بخشی غلام محمد یہاں آئے تو کچھ اور ہی سماں بندھا ہوا دیکھا اور حالات کو قابو سے باہر پایا۔

موئے مقدس کی جو تحریک چلی یہ خود بخود پھیل گئی، کوئی لیڈر اس کو چلانے والا نہیں تھا ابتداء میں دو نوجوانوں یعنی شیخ صاحب کے صاحبزادے شیخ محمد فاروق اور میرواعظ خاندان کے مولوی محمد فاروق کے نام پر عوام میں مشترکہ ہدایات کا اعلان کیا جاتا۔ یہ تحریک کئی دن جاری رہی اور ان تمام دنوں شہر میں مکمل ہڑتال رہی۔ عوام کو ربط وضبط میں رکھنے والی کوئی سیاسی ہستی سامنے نہیں تھی اس لئے کسی تجربہ کار سیاسی رہنما کی رہنمائی کی ضرورت تھی، اس غرض کیلئے شیخ فاروق نے مولانا محمد سعید صاحب مسعودی سے رہنمائی کی استدعا کی مولانا ان دنوں دور ایک دیہات میں پڑے تھے اور فاروق صاحب انہیں سرینگر لے ہی آئے بعد میں یہ ساری تحریک مولانا صاحب کی قیادت میں چلی۔ اس دوران، مولانا مسعودی کے جو سب سے بڑے دو کارنامے ہیں وہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی استواری اور مولوی فاروق کو سیاسی شخصیت کے طور پر ابھارنا ہے، مولوی فاروق کم سن تھے اور سیاست سے نابلد۔

بخشی غلام محمد کے حامیوں کے ہاتھ سے چونکہ میدان جاچکا تھا اس لئے صادق صاحب اور قاسم صاحب نے اس موقع کو غنیمت جانا اور عوامی صفوں میں گھس کر نمودار ہونے کی کوشش کی، شمس الدین وزارت میں انہیں نہیں لیا گیا تھا اور

گوشۂ خلوت میں پڑ کر سیاسی بقا کی امید چھوڑ بیٹھے تھے لیکن عوام نے انہیں کروٹ بدل کر پاس پھٹکنے نہیں دیا۔

موئے مقدس کی واپسی کے مطالبہ کرنے کے لئے صرف مسلمانوں ہی کے جلوس نہیں نکلے بلکہ ہندوؤں کے چھوٹے بڑے جلوس بھی نکلے، اس سلسلے میں ہندوؤں کا جو سب سے بڑا جلوس نکلا اور شہر کے مختلف بازاروں سے گھوم کر لال چوک میں ختم ہوگیا اس کی رہنمائی کرنے والوں میں، میں بھی شامل تھا، جلوس کے اختتام پر جو عظیم جلسہ منعقد ہوا اس میں میں نے بھی تقریر کی۔ لطف کی بات ہے کہ اس جلوس کے ساتھ ساتھ چند ایک مسلمان اصحاب بھی تھے جو غالباً اس جلوس کے پس پُشت انسانی برادری، باہمی بھائی چارہ اور محبت اور مساوات کے جذبہ سے بیحد متأثر ہوئے تھے۔ وہ جلوس میں ہندو دھرم کی فتح کے نعرے لگاتے رہتے۔ اسی جلوس میں اہل ہنُود اسلام زندہ باد کے نعرے لگاتے رہے اس جلوس کی آؤ بھگت مسلم برادران وطن نے ہر جگہ کھلے دل سے کی اور اہل جلوس کی بہت شفقت اور محبت سے کھانڈ کھلاتے اور شربت پانی پلاتے مذہبی رواداری، فرقہ دارانہ ہم آہنگی اور باہمی پیار و محبت کی ایسی شاندار اور قابل تقلید مثال دنیا کی تاریخ میں شاید ہی کہیں اور ملے!

اس المناک سانحہ کے دوران وہ محبت بھرا ماحول اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے اور اس کی یاد میرے ذہن میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔ میں اپنے عظیم لوگوں کی باہمی پیار و محبت و خلوص کی ایسی عظیم روایات اور ایسے اعلیٰ اور عظیم کردار کے سامنے تعظیم کے ساتھ سر جھکاتا ہوں اور ان کو اپنا عقیدت بھرا سلام عرض کرتا ہوں اس تحریک کے دوران میں نے کئی تقریریں کیں جن میں۔ میں نے جہاں موئے مقدس کی گمشدگی کی تحقیقات کر کے اس کو فوری طور برآمد کرنے کا مطالبہ حکومت سے کیا وہاں کشمیر کی خاک پاک کی تعریف کرتے ہوئے اس کو ریشیوں منیوں اور صوفی سنتوں کی آماجگاہ جتلایا جن کا پیغام باہمی میل و ملاپ ہے۔

اس تحریک کے دوران نعرے عام طور پر مذہبی قسم کے لگتے تھے۔ نعرہ لگانے میں بڑی احتیاط کی جاتی تھی اور سیاسی قسم کے نعرے نہیں لگائے جاتے تھے تاہم غیر منظم جلوسوں میں یا جلسوں سے بکھرے ہوئے لوگوں کے جھنڈ میں "پاکستان زندہ باد"

کے نعرے لگتے تھے اور کئی مسجدوں اور مکانوں پر پاکستان کے جھنڈے لہرائے گئے۔ کشمیر کی تاریخ میں پہلی بار عوامی سطح پر بانگ دہل اس قسم کے نعرے لگے اور یہ جھنڈے لہرائے گئے اس وسیع تحریک سے عوام کو اطمینان ہو گیا کہ یہاں کی حکومت ناپائیدار ہے اور انہیں وطن دشمن نعرے اور قابل اعتراض جھنڈے لہرانے کی کھلی ڈھیل حاصل ہے۔ یہ صورت حال سنہ ۱۹۶۵ء کے پاکستانی حملہ کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اس طرح سے پاکستان کو ترغیب اور حوصلہ ملا کہ وہ کشمیر پر منظم حملہ کرے

کئی روز کی لگاتار کھوج کے بعد موئے مقدس کو حضرت بل کے احاطہ میں ہی پایا گیا۔ مرکزی سرکار کا شعبۂ سراغ رسانی موئے مقدس کی تلاش اور اس واقعہ کی تحقیقات کر رہا تھا۔ مقامی پولیس کو اس میں دخل دینے کی اجازت نہیں دیدی گئی سی۔ بی۔ آئی۔ کے کئی اعلیٰ افسر بڑے عملہ کے ساتھ کئی دن اس کی تلاش کرتے رہے۔ آخر بر مل ہی گیا۔ لوگوں کے قلب و ذہن کو یقین دلانے کے لئے اس کی شناخت واقف کار حضرات اور علمائے دین سے کرائی گئی اس کی تصدیق اور شناخت کرنے والوں میں مولانا محمد سعید مسعودی، مولوی فاروق اور یہاں کے ایک برگزیدہ روحانی پیشوا میرک شاہ صاحب بھی شامل تھے جو حال ہی میں رحمت حق ہوئے

موئے مقدس کی تحریک کے آغاز میں ریاستی حکومت کو نااہل قرار دیکر اسے شدید تنقید کا شکار بنایا گیا لیکن ساتھ ہی مرکزی سرکار سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ کشمیر میں صدر راج نافذ کرے

"حضرت محمدؐ کے موئے مقدس کی گم شدگی کی دریافت کرنے کے لئے قایم کی گئی ایکشن کمیٹی کے اہتمام سے کل یہاں ایک عوامی اجتماع میں مطالبہ کیا گیا کہ کشمیر میں صدر ریاست کی حکومت حاوی کی جائے۔ اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے شیخ عبداللہ کے صاحب زادے فاروق عبداللہ نے کہا، کہ غنڈے لوگوں کو خوف زدہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔۔۔۔۔ اس نے مزید کہا کہ اچھا ہوگا اگر صدر ریاست ڈاکٹر کرن سنگھ ریاست کی ساری مشینری کو اپنے ہاتھ میں لے لیں" [۱]

---

[۱] اخبار ٹائمز آف انڈیا نیو دہلی مورخہ ۱۴ جنوری سنہ ۱۹۶۴ء

ہندوستان کی سرکار اور رہنماؤں نے موئے مقدس کی گم شدگی کے ساتھ کو نہ صرف مسلمانانِ کشمیر کے لئے باعث تشویش قرار دیا بلکہ سارے ہندوستانیوں کے لئے باعث پریشانی تصور کیا۔ اس کے برعکس پاکستان اور وہاں کے اس وقت کے وزیر خارجہ نے اس واقعہ کو صرف کشمیری مسلمانوں کے لئے سانحہ قرار دیا جس پر یہاں کے ذی شعور اور فہمیدہ مسلمان پاکستان سے ناراض ہو گئے۔ پاکستان نے اسلامی سٹیٹ ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود مذہبی امور میں بھی کشمیری مسلمانوں سے اپنی علیحدگی کا ثبوت دیا۔

موئے مقدس کے بازیاب ہونے کے بارے میں مختلف قسم کی چہ میگوئیاں ہوتی رہیں، کچھ اصحاب کا خیال ہے کہ اصلی موئے مقدس بازیاب نہیں ہوا بلکہ حالات سدھارنے کے لئے اصل موئے مقدس کا کوئی نعم البدل پیش کیا گیا ہے، مولانا محمد سعید مسعودی سابق جنرل سیکرٹری نیشنل کانفرنس نے مانگ کی کہ موئے مقدس کی مکمل شناخت کی جائے انہوں نے کہا کہ صرف اسی سے کشمیر کے لوگ اس کے اصلی ہونے سے مطمئن ہو جائیں گے[1] اس بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ موئے مقدس ملنے کے بعد اس کی شناخت کرنے کے لئے جو کمیٹی بنائی گئی مرکزی سرکار نے ان ممبران سے بڑے تدبر اور سلیقہ سے اس کو اصلی موئے مقدس کے طور پر تسلیم کروایا، دوسری رائے یہ ہے کہ ان ممبران اور کچھ حلقوں نے یہ سوچ لیا کہ اگر اسکو اصلی موئے مقدس قرار دینے کی ذمہ داری قبول نہ کی جائے تو لوگوں کا اعتقاد اس پر سے متزلزل ہو جانے کا احتمال ہے اور آثار شریف حضرت بل کی مذہبی اہمیت بھی متاثر ہو جانے کا اندیشہ ہے

بعض حلقوں کی رائے ہے کہ موئے مقدس چوری نہیں ہوا تھا بلکہ یہ منتظمین کی تحویل میں محفوظ تھا اور اس کو دیدہ دانستہ طور سیاسی اغراض کے لئے استعمال کیا گیا اگرچہ بعض حلقے اب بھی موجودہ موئے مقدس کے اصل ہونے میں مشکوک ہیں تاہم موئے مقدس کی گم شدگی اور اس کی تلاش ناقابل سمجھ راز ہے جو آج تک فاش نہیں ہو سکا ہے اور جس سے آج تک عوام بالکل بے بہرہ و بے خبر ہیں۔

مرکزی سرکار کے محکمہ سراغرسانی کی مشنری فوراً حرکت میں آئی اور ریاستی پولیس کا تعاون حاصل کئے بغیر اس کی تحقیقات اور تلاش کی لیکن آج تک

---

[1] اخبار "ٹائمز آف انڈیا" نئی دہلی مورخہ ۱۴ جنوری سنہ ۱۹۶۴

وثوق کے ساتھ نہیں کہا گیا کہ کیا موئے مقدس واقعی چوری ہو چکا تھا۔ اگر چوری ہوا تھا تو کس نے چرایا تھا اور کس نیت سے چرایا تھا؟ اور کیا اس سانحہ کے پیچھے کوئی سازش کارفرما تھی؟ اور اگر تھی تو کون تھی اور کیونکر تھی؟ ماخوذ ملزموں کو گرفتار کیوں نہیں کیا گیا؟ اور اگر گرفتار کیا گیا تو وہ کہاں گئے اور ان کے خلاف مناسب قانونی کارروائی کیوں نہیں کی گئی اور اس بارے میں تمام تفصیلات عوام کو کیوں فراہم نہیں کی گئیں؟ یہ ایسے سوالات ہیں جو یہاں ہر کسی کے ذہن میں ابھرتے رہتے ہیں۔ لیکن جن کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملتا ہے۔

بخشی وزارت میں محکمہ سی آئی ڈی کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ خواجہ غلام حسن کاوسہ محکمہ سراغ رسانی کا کرتا دھرتا تھے اور وزیر اعظم بخشی غلام محمد کے بااختیار اور راز دار مصاحب تھے، موئے مقدس کی تحریک کے بعد اگست ۱۹۶۴ء میں پر اسرار طور ان کی موت واقع ہوئی۔ اگرچہ ان کی موت کی وجہ خودکشی بیان کی گئی لیکن بعض حلقوں کا خیال ہے کہ انہیں قتل کیا گیا تھا کیونکہ وہ بہت سے رازوں کا مجسمہ تھے اور موئے مبارک کی گمشدگی کی وجوہات اور اس کے ملزموں کی نسبت بھی انہیں علمیت تھی اس لئے افشائے راز سے ہمیشہ کیلئے باز رکھنے کے لئے کاوسہ صاحب کو ابدی نیند سلادیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی موت مشکوک حالات اور مشکوک انداز میں ہوئی لیکن آج تک اس راز سے کبھی پردہ نہ اٹھ سکنے کے باعث اصلیت قیاس آرائیوں کے دامن میں دفن ہو گئی ہے۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ ”موئے مقدس کی بازیابی اور اصلی مجرموں کا کھوج لگانے کے لئے جب مرکزی حکومت کے محکمہ سراغ رسانی کے ڈائریکٹر جنرل مسٹر ملک نے مشتبہ اشخاص کو یہ وارننگ دی کہ اگر چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر موئے مقدس کو برآمد نہ کیا گیا تو وہ سخت ترین اقدامات کرکے ان تمام مشکوک افراد کو قانون کے حوالے کرینگے تو اس مرحلہ پر اصلی مجرم نے مسٹر ملک سے یہ وعدہ لیا کہ وہ اس شرط پر موئے مقدس واپس دینگے کہ ان کا نام قیامت تک ان کی زبان پر نہ آئے۔ ملک صاحب کے لئے اس وقت سب سے اہم کام موئے مقدس کی

بازیافت تھی اس لئے انہوں نے وعدہ کیا کہ اگر انہیں موئے مقدس مل جائے تو وہ اصلی مجرم کا نام تک بھی زبان پر نہ لائیں گے"۔ ل

موئے مقدس کی سازش آشکارا ہونے کے لئے ہر جماعت، ہر فرقہ اور ہر طبقہ خواہاں ہے۔ لیکن پھر بھی یہ سازش سربستہ راز ہی بنی رہی ہے۔

"یہ انتہائی افسوسناک بات ہے کہ تقریباً ایک سال کا طویل عرصہ گذرنے کے باوجود بھی حکومت اس گہری سازش کا بھرم کھولنے میں آج تک ناکام رہی۔ یہ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ موئے مقدس کے دستیاب ہوتے ہی حکومت کے ذمہ دار آدمیوں نے یہاں کے عوام کو یقین دلایا تھا کہ ملزم کو کچہری میں پیش کیا جائے گا اور ملزم کو (چاہے چھوٹا ہو یا بڑا) عبرتناک سزا دی جائے گی۔ مگر ایسا دکھائی دیتا ہے کہ حکومت اس سانحہ عظیم سے متاثر نہیں ہوئی ہے اور نہ اُسے اس بات کا احساس ہے کہ عوام کے جذبات اور احساسات سے کھیلنا کوئی آسان بات نہیں ورنہ حکومت نے بہت عرصہ پہلے بتایا ہوتا کہ موئے مقدس کی خیانت میں کس کا ہاتھ ہے"۔ ۲

اگرچہ مرکزی سرکار نے دعویٰ کیا تھا کہ انہیں اس بارے میں ضروری جانکاری حاصل ہوئی ہے اور ملزموں کا پتہ بھی چل گیا ہے بلکہ انہیں حراست میں لیا بھی گیا۔ لیکن حکومت ہند کے وطیرہ سے یہ بات قابل باور ثابت نہ ہوئی۔ اس وقت کے مرکزی وزیر داخلہ شری گلزاری لال نندہ نے پارلیمنٹ میں پہلے ہی ایک بیان کے دوران ملزموں کے ناموں کا بھی انکشاف کیا تھا اور انکو زیر حراست لانے کا اعلان بھی ہوا تھا لیکن ان ملزموں کا بعد میں کیا ہوا؟ یہ آج تک کسی کو معلوم نہیں ہے۔ حکومت ہند کے مشکوک طرز عمل سے اتنا ظاہر ہوا کہ سرکار نے عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی اور ایک فرضی کہانی تخلیق کی۔ حق تو یہ کہ مرکزی سرکار نے اپنے طرز عمل سے موئے مقدس کے واقعہ میں خواہ مخواہ خود کو ایک جانبدار فریق کے طور پر نمایاں کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے اس سانحہ میں ذاتی دلچسپی لیکر

ل اخبار "آئینہ" سرینگر مورخہ ۷ اکتوبر ۱۹۶۴ء

۲ محاذ رائے شماری کی قرارداد بحوالہ اخبار "آفتاب" سرینگر مورخہ ۲۸ نومبر ۱۹۶۴ء

شری لال بہادر شاستری کو اس بارے میں سرینگر بھیجا گیا تھا اور حکومت ہند نے انتہائی ہمدردی کا ثبوت دیکر موئے مقدس کی تلاش میں سارا زور لگا دیا۔ یہاں کے لوگ، مرکزی سرکار کے اس رول کی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن اس سازش کا پردہ چاک نہ کر کے اور اصلی ملزموں سے عوام کو آگاہ نہ کر کے اپنا شاندار رول مشکوک بنالیا۔ اگر مرکزی سرکار کو کسی سازش یا کسی ملزم کا پتہ نہ چلا تھا، تو مرکزی وزیر داخلہ شری گلزاری لال نندہ کو ایسے ملزموں کے نام اور ان کی حراست کے متعلق، پارلیمنٹ میں بیان دیکر ہند سرکار کی پوزیشن مضحکہ خیز نہیں بنانی چاہئے تھی جن کے خلاف بعد میں نہ مقدمہ چلایا جا سکا اور نہ ہی کوئی تفصیل دی جا سکی۔ یہاں کے لوگوں کا خیال ہے کہ مرکزی وزیر داخلہ کا متذکرہ بیان صداقت سے دور تھا، اس لئے اپنے قابل تعریف اور شاندار رول کے باوجود اختتامی مبہم رویہ اور ناعاقبت اندیشی سے ہند سرکار نے موئے مقدس کے سانحہ میں خود ایک جانبدار فریق کا رویہ اختیار کرلیا اور اپنا وطیرہ مشکوک بنالیا اور اپنے اوپر رکھے اعتماد کو دھکا دلایا۔ جب تک ہند سرکار اس سانحہ کے پس منظر کی اطمینان بخش طریقے پر وضاحت نہیں کرتی وہ کشمیری عوام کے سامنے اپنے فرائض سے بری الذمہ قرار نہیں دی جا سکتی۔ اب بھی یہاں کے عوام کا مطالبہ ہے کہ "اصلی ملزم کو پیش کرو اور پوری تفصیل عوام کے سامنے رکھو" حکومت ہند پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس کی نسبت اپنی صفائی پیش کرے۔

فسطائی رُجحان

ابتدا سے ہی حکومت اور حکمران جماعت میں سالہاسال تک
آمرانہ رجحان پایا گیا جو فسطائیت کی حدوں کو چھو گیا۔ جمہوری
طریق کار بالکل مفقود ہو چکا اور عوام، حکومت اور حکمران جماعت سے
نالاں ہو گئے۔ صاف گو اخبارات کو سیاہ فہرست میں رکھ کر
سرکاری اشتہارات اور دوسری سہولیات سے محروم کیا گیا
اور تعریفی راگ الاپنے والے جریدوں کی سرکاری طور سے امداد
ہوتی رہی۔ اس وجہ سے وادی میں کوئی بھی انگریزی اخبار اُبھر نہ سکا
مقامی انگریزی اخبار کی کمی کو دور کرنے کے لئے اور یہاں کی انگریزی صحافت
کو زیر نگین رکھنے کے ساتھ ساتھ حکومت کا یک طرفہ پروپیگنڈا کرنے کے لئے
ریاستی سرکار نے بہت عرصہ پہلے سرینگر سے اپنا روزانہ اخبار انگریزی "نیوز"
جاری کیا تھا اور اس کے لئے علیحدہ پریس بھی لگوایا تھا لیکن حکومت
کو اس کی اشاعت جاری رکھنے میں ناقابل برداشت خسارہ
اٹھانا پڑا۔ حکومت کی کوشش ناکام ہو کر اخبار "نیوز"
کچھ مدت پہلے موت کی نیند سو گیا۔ سرینگر کے ایک غیر جانبدار
آزاد خیال اور واحد انگریزی اخبار "اکنامک پوسٹ" کا وجود بھی
حکومت ختم ہوا دیکھنا چاہتی ہے۔ حکومت کے انگریزی اشتہار تک بھی
اس اخبار کو نہیں دئے جاتے تاکہ وہ بھی اپنے منظور نظر اردو اخبارات
میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ حکومت کی سوچی سمجھی متعصبانہ، جانبدارانہ اور
امتیازی پالیسی کا شکار "اکنامک پوسٹ" بھی ہوا
ہے تاکہ یہاں صرف حاشیہ بردار پریس کو قائم رکھا
جائے۔ تنقید کرنے والے اخبارات کا شروع سے ہی گلا دبوچا گیا۔ پریس کو آزاد

نہیں بلکہ اطاعت پذیر بنا دیا گیا، یہاں کی نیشنلسٹ تحریک کا حامی اخبار وکیل اور اس کے بانی مدیر پنڈت شمبھوناتھ کول مرحوم کو ابتدا میں ہی حکومت کے فسطائی رجحان کا شکار بنا دیا گیا اخبار وکیل کی اشاعت عجیب ڈھنگ سے روک دی گئی سرکاری ایوانوں میں اخبار کی صحت مند نکتہ چینی کو برداشت نہیں کیا گیا۔

پنڈت شمبھوناتھ کول مرحوم کی وفات کے بعد اخبار "وکیل" کو شایع کرنے کی جو دوبارہ اجازت دی گئی۔ تو اخبار میرے بھائی شری شنکر ناتھ کول وکیل کی ادارت میں جاری ہوا لیکن حکومت نے پھر اُسے موت کی آغوش میں سُلا دیا۔ اس کے ایک عرصہ بعد کشمیر سرکار کی چیرہ دستیوں کو بے باکی سے طشت از بام کرنے کی غرض سے ۱۹۵۹ء میں دہلی سے اخبار "وکیل" انگریزی میں شایع ہو گیا جس کی ادارت کی ذمہ داری مجھ پر پڑی۔

۱۹۵۳ء کے وزارتی تغیر کے بعد نیشنل کانفرنس کی کنونشن میں جو تبصرہ اور نکتہ چینی تنظیم اور حکومت پر کی گئی تھی۔ وہ تنقید اب بھی حکومت اور حکمران جماعت پر صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اس کنونشن میں نیشنل کانفرنس نے عہد کیا تھا کہ آئندہ تنظیم اور حکومت میں پاکیزگی اور ستھرا پن لایا جائے۔ وزارتیں بدل گئیں اور تنظیمیں بن گئیں لیکن حکومت میں ستھرا پن آج تک نہیں آیا کنونشن کی سیاسی تجویز میں مستقبل کے لئے یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ ترقی پسند اور جمہوری قوتوں کا اشتراک عمل حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ "نیشنل کانفرنس کے مختلف شعبوں اور شاخوں کو جمہوری بنیادوں پر لایا جائے تاکہ دیانتدار اور وطن دوست...... عناصر کو ریاست کے مفادات کے لئے آگے بڑھنے اور کام کرنے کا موقع مل سکے ...... تنظیم کو عوام کُش اور ناخوشگوار رجحانات سے محفوظ رکھنا ہی انتہائی ضروری ہے ...... اب برداشت نہیں کیا جا سکتا کہ پارٹی کے بد دیانت عناصر اپنے ذاتی جاہ و جلال کو اپنے سیاسی کارناموں کے لئے استعمال کریں۔ جمہوری تحریک کا مستقبل زیادہ تر ایک جاندار، شستہ اور صحت مند تنظیم کی طاقت پر منحصر ہے ...... بہر کیف جلدی سے جلدی نیشنل کانفرنس کے کارکنوں کے دل سے طاقت اور اختیار کے آمرانہ طرز عمل کو خارج کر دیا جائے اس طریقہ پر چل کر تنظیم لوگوں کے زیادہ نزدیک آ سکتی ہے اور ان کے روزمرہ مسائل کو موثر طریقہ پر حل کر سکتی ہے۔"[۵]

---

۵ خواجہ صادق کا نوٹ منقول از اخبار "کشمیر" کنونشن نمبر سنہ ۱۹۵۴ء

اس کے باوجود ہوا کیا؟ یہی کہ نیشنل کانفرنس اور حکومت ایک بنی رہی۔ آمرانہ طرزِ عمل بدستور جاری رہا، گروہ بندی کا رجحان بڑھتا گیا اور لوگوں کے مسایل حکمرانوں کی نظروں سے اوجھل رہے۔

" یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ نیشنل کانفرنس کی لیڈرشپ کے ایک حصے نے اختیارات طاقت اور حکومت کو کچھ ایسے طریقے پر استعمال کیا جس سے تنظیم کے اندر گروہ بندی کے رجحانات بڑھتے گئے اور ایڈمنسٹریشن میں انفرادی دھاندلی اور عقیدت مندی پیدا ہو گئی اور نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں کے تعلقات کمزور ہو گئے۔ حکومت عوام سے دور جا پڑی اور اس نے جمہوریت پسند حلقوں کی خواہشات کی پرواہ کئے بغیر آمرانہ طرزِ عمل اختیار کیا۔ ذاتی جاہ و جلال اور وقار کی اس تگ و دو میں لوگوں کے مسایل اور بنیادی ضروریات نظر انداز کئے جاتے رہے۔ اور بالآخر کار ایڈمنسٹریشن ناکارہ ہو کر رہ گئی۔ ایک مسلسل، مضبوط اور ہم آہنگ انتظامی مشینری اور بھی بدتر ہو گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بدعنوانیاں عام ہو گئیں۔ مصارف کی کوئی طے شدہ پالیسی موجود ہی نہیں تھی، نتیجہ کے طور پر بے معنی اور طفلانہ سکیموں پر مجرمانہ طریقہ پر قوم کا روپیہ ضایع کیا گیا" [۱]

حکمران جماعت پر عوام کا اعتماد ... گھٹتا گیا اور لوگ اس کی لیڈرشپ سے الگ ہو گئے۔ اس کے رہنما ذاتی اغراض کیلئے تنظیم کے سایہ میں ایسے اشخاص کی پرورش کرنے لگ گئے جو پرامن شہریوں کیلئے خوف و ہراس کا باعث بنے، ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کے قیام کے اعلان پر اس کے رہنماؤں نے اس کا ذکر یوں کیا۔

" ہمیں انتہائی افسوس کے ساتھ آج یہ اعلان کرنا پڑتا ہے کہ نیشنل کانفرنس عوام کی ترجمانی کا حق کھو بیٹھی ہے اور اقتدار پسندوں کی ایک ٹولی کا آلۂ کار بن چکی ہے۔ اس تنظیم کے اندر ایمان دار اور نامور افراد کی حوصلہ افزائی اس حد تک ہوئی ہے کہ سماج دشمن عناصر تنظیم کا سہارا لیکر امن پسند شہریوں میں دہشت پھیلاتے ہیں" [۲]

نیشنل کانفرنس کا صاحب اقتدار ٹولہ دراصل ریاست میں جمہوری فضا قایم

---

[۱] خواجہ صادق کا نوٹ منقول از اخبار "کشمیر" کنونشن نمبر ۲۹ ۱۹۵۹ء

[۲] ایضاً " کنونشن نمبر

ہونے نہیں دیتا تھا، ذرا سا اختلاف کرنے والوں کو سختی سے دبایا جاتا اور تنظیم پر اس طرح چھایا ہوا تھا کہ اس کی مکمل اجارہ داری حاصل کی تھی۔

"دراصل کوشش یہ تھی کہ نیشنل کانفرنس اور حکومت پر مکمل اجارہ داری قائم کر کے ان لوگوں کو بے دست و پا کر دیا جائے، جو سیاسی اور سماجی زندگی میں جمہوریت کا فروغ چاہتے ہیں۔

صاحب اقتدار گروہ کا یہ مطالبہ تھا کہ جمہوری تنقید کا دروازہ بند کر دیا جائے اور ہر شخص کی زبان پر تالے لگا دئے جائیں تا کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور ہو، وہ اور اُن کے دوست، احباب اور رشتہ دار بلا روک ٹوک مال و دولت جمع کریں اور زندگی کے ہر شعبہ میں مطلق العنان حاکم بن جائیں۔

مختصر یہ کہ تنظیم اور سرکاری مشینری ان چند برسوں میں وہیں پہنچ گئی جہاں پھر وہ تمام تنقیدیں جائز تھیں جو ستمبر ۱۹۵۳ء کے کنونشن میں کی گئی تھیں[۱]

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نیشنل کانفرنس حکومت شروع سے ہی فسطائی رجحان کو پروان چڑھاتی رہی عوام کو حکومت پر تنقید کرنے سے باز رکھنے کے لئے پیس برگیڈ نامی سرکاری جماعت کو معرض وجود میں لایا گیا۔ اس کے افراد کا کام بوقت ضرورت پُر امن شہریوں کو خوف زدہ کرنا، ہلڑ بازی مچانا اور سیاسی مخالفین کی مار پیٹ کرنا تھا، صادق صاحب نے اپنے دورِ وزارت میں اس جماعت کو ختم کر کے ہوم گارڈ نامی تنظیم کو منظم کیا پیس برگیڈ میں بہت سے افراد ایسے تھے، جو ناشائستہ تھے اور جن کا چال و چلن سخت مشکوک رہا تھا، ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کو وجود میں لانے کے بعد صادق صاحب نے اس بات کا اعتراف یوں کیا تھا۔

"ان میں کچھ ایسے لوگ بھی شامل ہیں جن کا پیشہ جیب تراشی اور جوا بازی ہے اور جن کا نام مہاراجہ ہری سنگھ کے وقت "دس نمبریوں" میں شامل تھا۔ پیس برگیڈ کو ہر تحصیل میں تحصیل صدروں کے ماتحت رکھا گیا اور ان کا کام

۱۔ [illegible]

یہی رہا کہ وہ ان کے احکام بجالائیں، اُن کا سیاسی کام یہی رہا کہ جلسے توڑے جائیں اور لوگوں پر پتھراؤ کیا جائے اور شریف لوگوں کی مار پیٹ میں حصہ لیں۔۔

...... پیس بریگیڈ کے جن افراد نے یہ کام (مار پیٹ) کرنے سے انکار کیا ان کے خلاف مقدمے کئے گئے۔ حال ہی میں اننت ناگ میں کچھ جوانوں نے یہ ذلیل کام کرنے سے انکار کیا، کیوں کہ ضمیر نے انہیں اجازت نہیں دی تو ان کے خلاف دوسرے ہی دن دفعہ ۱۰۷ کے تحت چالان کروایا گیا اور ان پر امن شکنی کا الزام لگایا گیا۔ دو سال پہلے بخشی صاحب کے پاس اننت ناگ سے ایک لڑکا آیا، اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی اور بُری طرح زخمی تھا، اور اس نے شکایت کی کہ پیس بریگیڈ والوں نے اس کو زدوکوب کیا ہے۔ بخشی صاحب اس کی حالت دیکھ کر خود رو پڑے، اس کو پندرہ دن کے لئے نرسنگ ہوم میں داخل کیا گیا" ۵

اپنے ایام اسیری کے دوران جیل سے شیخ محمد عبداللہ نے ریاست میں شہری آزادی کے خاتمہ اور شہریوں کو دہشت زدہ کرنے کے لئے "سول فوج" کے قیام کے سلسلے میں پریذیڈنٹ آئین ساز اسمبلی خواجہ غلام محمد صادق کو ایک مراسلہ بھیجا تھا یہ مراسلہ ۲۶ اگست سنہ ۱۹۵۶ کا ہے۔ اس کا ایک اقتباس یہاں درج کرنا خالی از دلچسپی نہیں ہوگا۔

" جیسے جنگل کا یہ قانون (احتیاطی نظر بندی ایکٹ) کافی نہیں تھا کہ آپ کی حکومت نے ایک گراں قیمت پر "سول فوج" کی تنظیم کی۔ جو کہ پیس بریگیڈ یا سپیشل پولیس کے نام سے مشہور ہے اور جس کا اہم کام یہ ہے کہ لوگوں کی سرعام مار پیٹ کی جائے۔ روز روشن میں انہیں لوٹا جائے اور باقی ظلم ان آدمیوں پر کئے جائیں۔ جو آپ کی حکومت کے مخالف ہیں اور اس طرح سے اسکو بحال رکھنے میں مدد دیتے ہیں، اس جماعت میں زیادہ تر تعداد غنڈوں اور ان سماج دشمن عناصر کی ہے جن کا ماضی تاریک رہا ہے اور جن کا کام پرامن شہریوں میں دہشت پھیلانا ہے، ریاست میں شہری آزادی کو بالکل دفن کیا گیا ہے اور جائز سیاسی سرگرمی کو ختم کرکے "پبلک لائف" کو مفلوج کیا گیا ہے ۶"

پولیس پر اخراجات بدستور بڑھتے جا رہے ہیں۔ لیکن جرائم کی تعداد میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے مقامی پولیس کے علاوہ ریاست میں باقی صوبوں کی پولیس نفری بھی متعین رہتی ہے۔ پولیس پر یہاں جو کل خرچہ آتا ہے وہ تناسب کے لحاظ سے ہندوستان کے سب صوبوں سے زیادہ ہے، یہ خرچہ کل مقامی آمدن کا ۲۰ فی صد حصہ سے بھی زیادہ ہے۔

"پولیس پر اخراجات سنہ ۱۹۵۵-۵۶ء میں ۴۳-۶۳ لاکھ روپے تک بڑھ گئے ہیں اور سنہ ۱۹۵۶-۵۷ء میں جبکہ ایک ابزادی شاخ "انڈسٹریل پولیس" ۲۷-۲۹ لاکھ روپے کے خرچہ کے تخمینہ سے قایم کی گئی، یہ اخراجات 93. 47 لاکھ روپے تک بڑھ گئے۔ بسال سنہ ۱۹۵۶-۵۷ء میں پولیس پر کل خرچہ۔ سی آئی ڈی اور سیکرٹریٹ سروس کے بغیر سنہ ۱۹۵۴-۵۵ کی نسبت دوگنا یعنی 22. 75 لاکھ روپے ہے......

پیس بریگیڈ پر کل خرچہ جس کا نام اب سپیشل پولیس رکھا گیا ہے اور جو کہ لاء اینڈ آرڈر کو قایم رکھنے کے نام پر عام انسانی حقوق کو دبانے کا ایک بڑا آرگن ہے پر خرچہ میں سنہ ۱۹۵۴-۵۵ کے 26.۲ لاکھ روپے سے سنہ ۱۹۵۵-۵۶ کے لئے 5.43 لاکھ روپے تک اضافہ ہوگیا ہے۔ یعنی اڑھائی گنا سے زیادہ"۔[۵۷]

سیاسی مخالفین کو مختلف طریقوں سے تنگ کیا جاتا تھا۔ ان کے خلاف آتش زنی، مارپیٹ وغیرہ کے چالان دائر کرکے ہراسان کیا جاتا، بقول صادق صاحب "سیاسی مخالفین" کو اس طرح سے دبانے اور ان سے انتقام لینے کا طریقہ مہاراجہ ہری سنگھ کے دورِ حکومت میں بھی نہیں تھا جس کے خلاف "کشمیر چھوڑ دو" تحریک بھی چلائی گئی تھی، اور کبھی اس دوران میں خود بخشی صاحب یا صادق صاحب یا اُن کے کسی دیگر ساتھی یا کارکن کے خلاف کوئی ایسا مقدمہ یا واقعہ پیش نہ آیا"

صادق صاحب نے اپنی ایک پریس کانفرنس میں تنظیم اور حکومت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا تھا

"سنہ ۱۹۵۴ء سے جنرل سیکرٹری کا جو زمانہ دیکھ رہا ہوں اس کی کوئی اور مثال ملنی

---

۵۷ "بجٹ جگلری آف جموں اینڈ کشمیر" شری گردھاری لال آنند صفحہ نمبر ۱۳، ۲۰

مشکل ہے البتہ سکھوں اور مغلوں کے زمانے میں جو گورنر مقرر کئے جاتے تھے ان کی مثال موجودہ جنرل سکریٹری پر صادق آتی ہے - اصل میں ساری طاقت تنظیمی اور حکومتی ایک ہی شخص کے ہاتھ میں سونپ دی گئی ہے ۱۹۵۳ء سے ہی ہم نے شخص پرستی کے خلاف آواز بلند کی- ہم نے کہا تھا کہ نیشنل کانفرنس میں شخص پرستی ایک گراوٹ ہے ہم نے شیخ صاحب جیسے بڑے لیڈر کو معاف نہیں کیا - اس کے بعد......... جس کا تحریک آزادی میں کوئی حصہ نہیں رہا ہے، جو کہ ۱۹۴۹ء تک سرکاری ملازم تھا، آتا ہے اور اس کے ہاتھ تمام اختیارات سپرد کئے جاتے ہیں - ان تمام باتوں کا اثر ہماری بنیادوں پر پڑتا ہے اور ہماری بنیادیں ہل جاتی ہیں - ایسے لوگ جو ہندوستان کے ساتھ الحاق کے خلاف نہیں مجبوراً دوسری جماعتوں میں شامل ہو گئے"۱

ایک عجیب قسم کی حکومت قائم تھی - گھر پنچی راج قائم تھا "ہش مش" جیسی پرائیویٹ غنڈہ گرد جماعتیں تھیں جن کی اعانت کے بل بوتے پر لوگوں کے ذاتی معاملات میں بھی دخل اندازی ہوتی تھی - ایک وقت کی ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کے سربراہ صادق صاحب اپنی ایک پریس کانفرنس میں فرماتے ہیں لیکن نشہ اقتدار اور حوادث زمانہ کا کیا کہئے - کہ کچھ ہی سال بعد ان تمام باتوں کو بھول کر وہ شریک اقتدار ہونے کی خاطر اسی جماعت میں واپس آ گئے -

"پچھلے اڑھائی سال میں اس گروہ نے امن پسند شہریوں پر سختیاں کیں- سیاسی معاملات کے علاوہ لوگوں کے ذاتی معاملات میں بھی انہوں نے دخل اندازی کی- یہاں تک کہ مکانوں کے کرایہ کے سلسلے میں جن کے لئے عدالتیں مقرر ہیں "ہش مش" مداخلت کرتے ہیں - اسی پر بس نہیں- کئی مثالیں ایسی ہیں جہاں انہوں نے زبردستی لوگوں کی جائیدادوں پر قبضہ کیا - اسی طرح عام نظم و نسق میں بھی مداخلت ہوتی رہی تنظیم کے کچھ افراد کی طرف سے جہاں لاء اینڈ آرڈر میں بھی مداخلت کی جاتی ہے وہاں سرکاری عہدیداروں پر بھی دباؤ ڈالا جاتا ہے، نیشنل کانفرنس ورکنگ کمیٹی کے چھ ممبروں نے ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کو تشکیل دینے سے پہلے اسکے صدر بخشی غلام محمد کو اپنے استعفوں کے مشترکہ خط میں لکھا تھا

---

۱ اخبار "کشمیر" سرینگر ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۷ء ۲ اخبار "کشمیر" سرینگر ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۷ء

" عوامی زندگی بدانتظامیوں کا شکار ہو رہی ہے اور ایڈمنسٹریشن کے مختلف محکمہ جات پر اس کے شدید بد اثرات پڑ رہے ہیں، محکمہ پولیس اور لاء اینڈ آرڈر تنظیم کے کچھ افراد کی مرضی اور انکی من کی موج کے تحت کام کرنے پر مجبور کئے جا رہے ہیں۔ اس وجہ سے ریاست میں جمہوریت کی بنیادیں ہل رہی ہیں۔ نیشنل کانفرنس کے کچھ سرکردہ عہدیدار اپنے کام کے اصلی مقصد کو بھول کر اپنی اغراض کے لئے ایڈمنسٹریشن میں مداخلت کرنے اور سرکاری عہدیداروں پر دباؤ ڈالنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ پیس بریگیڈ کا کام عوام کے مفادات کا تحفظ کرنا ہے لیکن یہ جماعت بہت ساری صورتوں میں امن پسند عوام کے ساتھ برتاؤ کرنے میں دہشت پھیلانے کا ذریعہ بنی ہے"

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ریاستی حکمران خود غنڈوں کی پیٹھ ٹھونک کر غنڈہ گردی کو بڑھاوا دیتے رہے اور عوام پر نہیں بلکہ ان غنڈوں پر حکومت چلانے میں تکیہ کیا جاتا رہا۔ ان کے جرم معاف کئے جاتے اور ان کے کارناموں کو تحسین بھری نظروں سے دیکھا جاتا۔

" بھور کیمپ میں گذشتہ مہینوں میں ناجائز شراب کی برآمدگی کے سلسلہ میں پولیس اور محکمہ اکسائز نے چھاپہ مارا اور چھاپہ کے دوران وہاں کے غنڈوں نے پولیس پر حملہ کر دیا جس کے نتیجہ کے طور پر کئی ملازم سرکاری افسروں کے اپنے بیان کے مطابق گھایل ہوئے جس کے جرم میں صوبائی نیشنل کانفرنس کی ایگزیکٹو کمیٹی کے ممبر بھور کیمپ "مشہور ـــــ" اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے کئی دنوں تک حوالات میں رکھا گیا۔ اس کے بعد چاہئے تو یہ تھا کہ پولیس فوری طور پر چالان مرتب کر کے عدالت میں پیش کرتی۔ مگر ایک لمبا عرصہ گذر جانے کے باوجود چالان پیش نہ کیا گیا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ گورنمنٹ نے سرکاری ملازموں پر حملہ کرنے والے ان ملزموں کے خلاف مقدمہ واپس لے رہی ہے۔ مقدمہ واپس لینے کے متعلق یہ عام چرچا ہے کہ بھور کیمپ کے غنڈوں نے بخشی عبدالرشید اور دوسرے حکمرانوں کی مکمل اطاعت قبول کر لی ہے اور انہوں نے حکمرانوں کو یقین دلایا ہے کہ آئندہ وہ ان کی مرضی کے مطابق ہی چل کر لوگوں کے سر پھوڑیں گے اور دوسرے جرم کریں گے" له

له اخبار "جے سودیش" جموں - مورخہ ١٧ جنوری ١٩٥٨ء

حکمران جماعت کے ممبر چودھری حکومت کے کاموں میں کھلم کھلا دست اندازی
کرتے رہے ہیں۔ تنظیم اور ایڈمنسٹریشن کے درمیان حدِ فاصل مٹ گئی تھی اور عدالت
دفترون کا بھی کوئی وقار باقی نہیں رکھا گیا تھا۔

"ہمیں اپنے درمیان اس حقیقت کو چھپانے کی ضرورت نہیں کہ ایڈمنسٹریشن
کا ڈھانچہ شکستہ حالت میں ہے اور بد دیانتی اور بد اعمالیوں کی وجہ سے اس
کی اہلیت کی بنیادیں کھوکھلی ہو رہی ہیں۔ نیشنل کانفرنس اور ایڈمنسٹریشن کے
کام کے درمیان حدِ فاصل مٹ گئی ہے۔ یہاں تک کہ پولیس اور عدالت کے کام میں
ہر سطح پر مداخلت دیکھنے میں آتی ہے، نتیجہ کے طور پر لوگوں کے دلوں سے اس
بات کا اعتماد کم ہوتا جا رہا ہے کہ قانون کی حکومت قائم ہوتی ہے[1]

انصاف کے اداروں میں مداخلت اور ان کے کام میں دست اندازی
کسی بھی جمہوری نظام میں سب سے زیادہ تشویشناک امر ہے، جمہوریت کے
تقاضا کے مطابق عدلیہ بالکل آزاد ہونا چاہئے۔ لیکن ریاست میں بڑھتے ہوئے
فسطائی رجحان کے سامنے جوڈیشری کا وقار گر گیا تھا، جو ایک غیر جمہوری ماحول کی
موجودگی کی نشان دہی کرتا ہے، ذی شعور طبقہ کو ہندوستانی سپریم کورٹ کا دائرہ
اختیار ریاست جموں وکشمیر پر بڑھائے جانے کی مانگ کرنا پڑی۔ ریاستی قانون ساز
کے ایوانوں میں فروری، مارچ سنہ ۱۹۵۸ کے بجٹ سیشن میں مخالف ممبروں نے
حکومت کی اس بارے میں شدید نکتہ چینی کی

"ڈیموکریٹک پارٹی نے بتایا کہ ریاست کے اندر انصاف کے ادارے
سرکاری مداخلت سے آزاد نہیں ہیں۔ بڑے بڑے فنبل اور با اثر قانون
دانوں اور ججوں پر دباؤ ڈالا جاتا ہے اور انہیں حکومت کی ہدایت کے مطابق کام
کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ حکومت اور چند باہر کے افراد کی مداخلت اور دباؤ کی
وجہ سے جوڈیشری کی غیر جانبداری اور خود مختاری میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے
حکومت نے آئین کی اچھی اچھی باتوں کی سرِ عام خلاف ورزی کا جو رویّہ اپنایا
ہے اس کے پیشِ نظر اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ
ہند کے آئین کی دفعہ 136 جو سپریم کورٹ کے متعلق ہے اسے ریاست جموں و

---

[1] صادق کا بخشی کے نام خط (صادق بخشی خط و کتابت ۲)

دکٹیٹر پر لاگو کیا جائے تاکہ سپریم کورٹ خصوصی اختیارات کی بنا پر ہائیکورٹ کے فیصلہ کے خلاف کسی اپیل کی سماعت کر سکے۔ جمہوریت کا تقاضا ہے کہ ایگزیکٹو جوڈیشری کے کام میں مداخلت نہ کرے" [۱]

حکمرانوں کی مرضی کے تابع کسی کو سزا بھی دی جاسکتی تھی اور کسی کو پھانسی سے بھی بچایا جاسکتا تھا یہاں نہ آئین کی پرواہ تھی اور نہ عدالتی احکام کی۔ میں جوڈیشری کے بارے میں کسی دوسری کتاب میں تذکرہ کروں گا۔ ریاستی ہائیکورٹ کے فل بینچ کے پاس ایک بار ریاستی وزیراعظم بخشی غلام محمد کے خلاف توہین عدالت کا دلچسپ مقدمہ دایر ہوگیا تھا۔ اس میں بخشی صاحب کو بری الذمہ قرار دیا گیا۔ اس درخواست کی دلچسپ کاروائی روزنامہ "ٹربیون" انبالہ کی ۱۹ اپریل ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں شایع ہوئی ہے جو کہ درج ذیل کی جاتی ہے

"توہین عدالت کی کاروائی ایک آدمی امرناتھ نے پرائم منسٹر کے خلاف اس مبینہ وجہ پر دائر کی تھی کہ بخشی صاحب نے ایک شخص زمان لون کی پھانسی اپنے احکام سے روک دی جس کو سیشن جج سرینگر کی عدالت سے پھانسی کی سزا دیدی گئی تھی، اس سزا کی توثیق ہائیکورٹ نے کردی اور مزید اپیل کرنے کی اجازت نہیں دیدی گئی تھی۔ "صدر ریاست" اور ہندوستان کے پریذیڈنٹ نے اس کی رحم کی درخواستوں کو مسترد کردیا۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۵۴ء کا دن پھانسی کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔

اس مبینہ وجہ کی بنا پر درخواست دہندہ کے ایڈوکیٹ شری رام ناتھ بھگوترہ نے یہ بحث کی کہ جب ہائی کورٹ نے بھی اس سزا کی توثیق کی، اور ہندوستان کے پریذیڈنٹ اور صدر ریاست نے بھی پہلے ہی مجرم کی رحم کی درخواستیں نامنظور کی ہیں اور پھانسی کی تاریخ بھی مقرر کی گئی تھی، پھر اس کے بعد اب اس میں کوئی ردوبدل نہیں کرسکتا، تو پرائم منسٹر کو اس طرح سے غیر قانونی طور دست اندازی کرکے مجرم کی پھانسی کو روکنے کا حکم دینے کا کوئی اختیار حاصل نہیں تھا۔ لیکن عدالت میں یہ ظاہر کیا گیا کہ صدر ریاست نے پرائم منسٹر کو پھانسی روکنے کے بارے میں ٹیلیفون پر کہا تھا

---

[۱] اخبار "جموں سندیش" جموں مورخہ ۲ اپریل ۱۹۵۸ء

جیل کی لعبد میں تصدیق کی گئی۔ اس پر ایڈوکیٹ مذکورہ نے کہا کہ اگر یہی مان لیا جائے کہ پرائم منسٹر نے صدر ریاست کی منظوری کے مطابق پھانسی روک لی لیکن جب پہلے ہی صدر ریاست نے اس کی رحم کی درخواست مسترد کر دی تھی اور ہندوستان کے پریزیڈنٹ نے بھی اس کی رحم کی درخواست مسترد کر دی تھی تو صدر ریاست کو بھی مجرم کی پھانسی روک لینے کا کوئی اختیار نہیں رہا تھا۔

مسٹر بھلگوترہ نے کہا کہ جبکہ ایک بار ہندوستان کے پریزیڈنٹ نے مداخلت کرنے سے انکار کر دیا تھا، تو صدر ریاست التوائے سزا، اور معافی وغیرہ کے متعلق اپنے اختیار استعمال نہیں کر سکتے۔

اس پر فاضل ججان نے کہا کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ صدر ریاست ایسا نہیں کر سکتے، لیکن یہ عدالت آرٹیکل 361 کے باعث ان کے مستثنیٰ ہونے کی وجہ سے کچھ نہیں کر سکتی ہے اور کہ سائل کی درخواست پرائم منسٹر کے خلاف ہے صدر ریاست کے متعلق نہیں لیکن سائل کے ایڈوکیٹ مسٹر بھلگوترہ نے بحث کی، کہ چونکہ صدر ریاست سزا کو ملتوی نہیں کر سکتے تھے، اس لئے اگر پرائم منسٹر نے صدر ریاست کے غلط حکم کے بارے میں کچھ کیا ہے، تو وزیر اعظم اس کے ذمہ دار ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے التماس کی کہ آرٹیکل 361 کے تحت جو پابندی ہے وہ صرف صدر ریاست کے اختیار یا فرض کے استعمال کے بارے میں ہے اور مذکورہ حکم دینے میں وہ کوئی فرض ادا نہیں کر رہے تھے، لیکن فاضل ججوں نے اتفاق نہ کرتے ہوئے درخواست کو نامنظور کر دیا۔

اس پر حکومت کی طرف کے ایڈوکیٹ اس وقت کے قائم مقام ایڈوکیٹ جنرل راجہ جسونت سنگھ نے یہ سوال اٹھایا کہ توہین عدالت کی درخواست دینے والے کے خلاف دفعہ 476 کے تحت کاروائی کرنے کے بارے میں غور فرمایا جائے۔

اس پر جسٹس مسٹر کلم نے کہا کہ کیس عیارانہ طور پر دائر نہیں کیا گیا ہے اور اس میں کافی موجبات ہیں، ہمیں فائل کا مطالعہ کرنے کے لئے اس کو پانچ دفعہ پڑھنا پڑا۔ جسٹس مسٹر شیمری نے کہا۔ اس کے علاوہ زمان لون کی پھانسی

"ڈکانے کا صدر ریاست کا حکم عدالت میں آج ہی پیش کیا گیا ہے"

بخشی صاحب کے سامنے قانون کا کوئی وقار نہیں تھا۔ وہ زبان سے کہے ہر لفظ کو قانون کی اہمیت دیتے تھے۔ "بخشی دور کا دوسرا پہلو یہ ہے، کہ انہوں نے اپنی کرسی بحال رکھنے کیلئے کنبہ پروری اور کورپشن کو بہت زیادہ تقویت دی۔ قانون شخص واحد کی میراث بن کے رہ گیا اور ایسے عالم میں بخشی کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کی حیثیت رکھتا تھا" ؎

کسی بھی قماش کے آدمی کو پُر امن اور ذی عزت شہری پر ترجیح دی جاتی اگر وہ بخشی صاحب کی اطاعت حاصل کرتا۔ شروع سے ہی بخشی صاحب کی یہ پالیسی رہی ہے کہ اگر سنجیدہ اور شریف شہریوں کی امداد اور اطاعت حاصل نہیں ہوتی تو اوباش قسم کے آدمیوں کو پُر امن اور شریف لوگوں کے اوپر ٹھونس جائے۔

"۱۹۴۸ء میں بخشی غلام محمد نے جموں میں نیشنل کانفرنسی کارکنوں کی ایک میٹنگ میں کہا تھا، کہ وہ جیل سے پچاس بدمعاشوں کو رہا کر کے صوبہ جموں میں نیشنل کانفرنس کی تنظیم کو کھڑا کر سکتے ہیں۔ کیا بخشی صاحب، آج کل اپنی اسی تجویز پر تو عمل کرنا نہیں چاہتے؟ کیونکہ اکثر دیانتدار اور کام کرنے والے کارکن تو نیشنل کانفرنس سے دھڑا دھڑ الگ ہو رہے ہیں!!" ؎۲

ریاست میں سیاسی زندگی کو مفلوج کرنے کیلئے احتیاطی نظربندی ایکٹ جیسا کالا قانون موجود ہے جس کی رُو سے کسی بھی شہری کو بلا وارنٹ مقدمہ چلائے بغیر جیل میں ڈالا جا سکتا ہے " اس ظالم قانون کا اکثر استعمال کیا جاتا ہے اور کلہاڑی عموماً اپوزیشن کے سرگرم ممبروں پر پڑتی ہے۔ یا اُن باشندوں پر جن کی جائز سیاسی سرگرمیاں اُنکے اقتدار کے لئے خطرہ کا باعث ہیں" ؎۳

؎۱ اخبار "پرتاپ" نئی دہلی مورخہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۶۷ء

؎۲ اخبار "سچ" جموں مورخہ ۲۲ مارچ ۱۹۵۷ء ؎۳ شیخ کا خط صادق کے نام، مورخہ ۱۶ اگست ۱۹۵۶ء

انتظامیہ کی ایک جھلک

عوام کو ایک پاک اور صاف ستھری ایڈمنسٹریشن سے فیضیاب ہونے کا آج تک
موقعہ نہیں ملا، سارا نظام ایسی بنیادوں پہ کھڑا کیا گیا ہے کہ ہر طرف مایوسی
کی تاریکی محیط ہو کر بیشتر سرکاری شعبوں میں صاف ستھرے پن اور پاکیزگی کی
کوئی کرن نہیں ملتی۔ بیشتر ذمہ دار افسروں میں اپنی فہم و ادراک سے اور اپنی
لگن سے کام کرنے کی خواہش نہیں رہی ہے وہ قابلیت سے نہیں بلکہ چاپلوسی سے
ترقی پانے کی کوششیں کرتے ہیں اور جی حضوری کر کے جب وہ حکمرانوں کے منظور نظر
بن جاتے ہیں تو وہ عوام کی پروا نہیں کرتے ہیں اور نہ ہی اپنے فرائض کی ر تب
وہ عوام کو لوٹنے لگتے ہیں، شریف اور قابل افسر بھی دیانتداری
سے کام نہیں کر سکتے ہیں۔

ور جب چھوٹے چھوٹے تانا شاہ اور رشوت خور افسر عام لوگوں کی برخوشی
میں زہر ملا کر ان کی زندگی اجیرن کر دیتے ہیں تو پھر عوام کے لئے مشکل ہو جاتا ہے
کہ وہ ملک کے اہم مسائل پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور جب بد دیانت اور بد اخلاق
افسر حکومت کے نشے میں چور ہو کر عام لوگوں کو ذلیل و خوار کرتے ہیں اور ان کی
جیبوں پر ہاتھ ڈالتے ہیں تو عوام کا ردعمل ان افسروں تک ہی محدود نہیں
رہتا بلکہ ان کی حرکتوں سے وہ حکومت کے کردار کا قیاس کرتے ہیں اور اپنے
روزمرہ تلخ تجربے کو آئینہ بنا کر اس میں ہماری پالیسی کا عکس دیکھتے ہیں۔
نیشنل کانفرنس کی حکومت اور نیشنل کانفرنس کے کارکنوں کو تسلیم کرنا چاہئے
کہ ابھی تک رشوت ستانی، بدعنوانی، نوکرشاہی اور دفتری گھس پگھس دور کرنے
کے لئے تمام ضروری اقدام نہیں کئے گئے ہیں.......... جہاں تک حکومتی
مشنری کا تعلق ہے اس میں بھی ہم کچھ نمایاں اصلاح نہیں کر پائے ہیں
رشوت ستانی اور کنبہ پروری روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اس کی بنیادی وجہ
یہ ہے کہ تنظیم کے اعلیٰ افسروں سے مل کر لوٹ کھسوٹ میں حصہ لے رہے ہیں

اس کے علاوہ حکومتی مشینری میں نوکرشاہی اور حاکمانہ طریق کار میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں آئی ہے" ۵۱

خواجہ غلام محمد صادق تنظیم اور حکومت کا ایک ذمہ دار رکن ہونے کے باوجود حکومتی سطح پر رواں خامیوں کو دبی زبان میں تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئے اور عوام چکی کے دو پاٹوں میں پسے جا رہے تھے۔ منتریوں کا دامن بھی پاک نہیں رہا ہے اس لئے الٹی روش نیچے سے اوپر تک جاری رہی۔ خواجہ غلام محمد صادق وزیر تعلیم نے اس وقت کے وزیر اعظم کشمیر بخشی غلام محمد کو ایک خط کے جواب میں لکھا تھا

"آپ کے خط سے ایسا محسوس ہوا۔ کہ میں نے ایڈمنسٹریشن کے بارے میں اپنے خط میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا، ان سے آپ ناراض ہوگئے تھے اس سے مجھے دکھ ہوا ہے۔ ہم نے ہمیشہ اس بات کو محسوس کیا ہے (جیسا کہ ورکنگ کمیٹی کے کئی فیصلوں سے بھی ظاہر ہوگا) اگر عوام کو ایڈمنسٹریشن کی انصاف پسندی اور غیر جانبداری کا روز افزوں یقین ہونا چاہئیے تو اس کے کام میں مختلف غیر سرکاری حلقوں کی مداخلت کا خاتمہ کرنا ضروری ہے۔ اس کے برعکس مجھے اندیشہ ہے کہ اس مداخلت میں اضافہ ہوا ہے۔

ورکنگ کمیٹی نے منتریوں کو یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ سرکاری ملازموں کو ماسوائے ان کے سرکاری کام کے وزراء کی رہائش گاہوں پر جانے میں حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔ اگرچہ منتریوں نے کم و بیش اس ہدایت پر عمل کیا ہے لیکن اب نیشنل کانفرنس کے کئی اہم عہدیداروں نے کھلم کھلا سرکاری افسروں کی سرپرستی کا بیڑا اٹھایا ہے جس سے ایڈمنسٹریشن کی اہلیت اور غیر جانبداری صاف طور پر متاثر ہوئی ہے۔ میں نے اس سلسلے میں پولیس اور عدلیہ کے محکمہ جات کا ذکر کیا تھا۔ کیونکہ ان محکموں کا آزادانہ طور پر کام کرنا کسی بھی جمہوریت کے لئے ضروری ہے۔" ۵۲

کچھ لوگ تو دیکھتے ہی دیکھتے فرش سے عرش تک پہنچ گئے اور لاکھوں کے

---

۵۱ مئی سنہ ۱۹۵۶ء میں نیشنل کانفرنس کی میٹنگ میں پیش کیا گیا صادق صاحب کا نوٹ۔ منقول از اخبار "کشمیر کنونشن نمبر" صفحہ ۱۵، ۵۲ صادق بخشی خط و کتابت صفحہ ۳۶، ۳۷

مالک بن گئے۔ ہندوستانی سرمایہ کی گنگا اپنے آدمیوں کے سوکھے اور ویران کھیتوں کو سرسبز و شاداب کرنے کے لئے بہائی جاتی ہے۔ یہ اس لئے ممکن ہوسکا کہ حکومت کو ایک طرف چھوڑ کر حکمران جماعت کی صفوں میں اخلاقی گراوٹ اور بد دیانتی نے جگہ پالی ہے اور عوام النّاس کی بھلائی کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا جاتا ہے، صادق صاحب نے وزارت سے الگ ہونے کے دوران اپنی ایک پریس کانفرنس میں اس طرف اشارہ کیا تھا۔

"ملک میں رشوت ستانی کی اس وقت جو وبا پھیلی ہے، وہ آج کی پیداوار نہیں ہے۔ البتہ اس زمانے میں اس نے خطرناک صورت اختیار کرلی ہے۔ اس کا سدّباب تب ہی ہوسکتا ہے جبکہ ہماری تنظیم کی صفوں میں اس کا اثر نہ ہو۔ میں یا کوئی اور تنظیم کا آدمی ایک راشی ملازم کے خلاف تب ہی آواز اٹھا سکتے ہیں جبکہ ہم خود ان برائیوں سے پاک ہوں، چونکہ ہماری اپنی صفوں میں اخلاقی گراوٹ اور بد دیانتی نے گھر کرلیا ہے اس لئے ہماری تنظیم سرکاری محکموں میں بدعنوانیوں کو دور کرنے سے قاصر رہی۔ عوام کے مفاد کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ مثالوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ دو سال کے اندر ایک آدمی نفی سے دو لاکھ روپے کی جائیداد کا مالک بن بیٹھا ہے" [۱]

قومی سرمایہ کا ناجائز استعمال ہوتا چلا آرہا ہے، حکومتی مشینری اس کے تدارک کے لئے حرکت میں نہیں آتی ہے اگر کبھی حرکت میں آتی بھی تو قصوروارو کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا جاتا۔

"رشوت اور کنبہ پروری کا زور بڑھ رہا ہے اور یہ بڑھنا اس لئے ضروری تھا کہ جن سرکاری ملازمین کے خلاف پبلک طور پر رشوت کے الزامات عاید کئے جاتے ہیں، ان کی بابت خاموشی اختیار کی جاتی ہے۔ ایک سپرانٹنڈنٹ پولیس جن کے خلاف خود پولیس نے کیس رجسٹرڈ کرا کے ہزاروں روپے کے غبن کا کیس ثابت کیا، انہیں ترقی دی گئی۔ اسداللہ میر صاحب ڈپٹی منسٹر

---

[۱] اخبار "کشمیر کنونشن" صفحہ نمبر ۴۷۔

(موجودہ اسمبلی سپیکر) کے خلاف ڈسٹرکٹ جج نے زمیندارہ بنکوں میں غبن کی تفتیش کے سلسلے میں حکومت کے پاس رپورٹ پیش کی لیکن محض چند چھوٹے چھوٹے ملازمین بنک کو معطل کرنے کے بعد ممبر صاحب کو معطل نہ کیا گیا۔ اسی طرح سپرنٹنڈنٹ جیل گڈ جہاں شیخ محمد عبداللہ بند ہیں کے خلاف گول مال کے الزامات عاید ہوئے لیکن ان سے باز پرس نہ ہوئی" ۵۱

قومی سرمایہ کے خورد برد اور غبن ہونے کی وارداتوں کی کئی مثالیں منظر عام پر نہیں آئی ہیں۔ سرکاری کار شاید ہی کوئی قسم ہو جو صاف و پاک ہو اور اس زد سے بچ گیا ہو۔ یہاں تک کہ کاشتکاروں کے نام پر تقسیم شدہ روپیہ فرضی ناموں پر تقسیم کیا جا کر دبایا جاتا ہے۔

"حکومت کشمیر کے محکمہ زراعت میں ۷۵ ہزار روپے کے غبن کا انکشاف ہوا ہے۔ یہ رقم کسانوں اور کاشتکاروں میں تقسیم کے لئے مخصوص تھی تاکہ وہ اچھی قسم کے بیج خرید سکیں۔ بتایا جاتا ہے کہ محکمہ کے ملازموں نے اس رقم کو آپس میں تقسیم کیا اور کاشتکاروں کو کچھ نہ مل سکا۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس سلسلے میں کئی جعلی رسیدیں بھی برآمد کی گئی ہیں" ۵۲

برسراقتدار جماعت کے نااہل اور نامنصفانہ رویہ کی وجہ سے ریاست کا سیاسی سماجی اور اقتصادی ڈھانچہ منہدم ہونے لگا ہے۔ منصوبہ بندی اور ایڈمنسٹریشن کے دیگر معاملوں میں دن بدن خامیاں پیدا ہو رہی ہیں۔

"کشمیر میں برسراقتدار جماعت نے سماجی ڈھانچہ کو ہندوستان سے بھاری امداد کے باوجود الجھا دیا ہے۔ وسیع رشوت ستانی، خویش پروری اور نااہلیت کی وجہ سے دباؤ اور بے چینی میں اضافہ ہو پایا ہے عوام کو کاغذی منصوبہ بندی اور خالی خولی و لفظی اور خیالی پروپیگنڈا میں کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے۔ ہندوستان میں کمیونٹی پروجیکٹ کو خاصی تعریف نصیب ہوئی ہے لیکن یہاں کہ بوٹی پراجیکٹ کے عجیب انتظام اور اس سلسلہ میں خیالی منصوبہ بندی کے باعث مایوسی نصیب ہوئی ہے

---

۵۱ شری گردھاری لال آنند کا مضمون بحوالہ اخبار "پرتاپ" نئی دہلی مورخہ ۱۸/۱۰/۱۹۵۵ء
۵۲ اخبار "ہمدرد" مورخہ ۱۲ اپریل ۱۹۵۹ء

یہ تدبر کے ساتھ محض ایک مذاق ہے کہ کمیونٹی پراجیکٹ کے افسران ایسے ہیں جنہیں اس بارے میں کوئی معیاری تربیت حاصل نہیں ہے اور ان میں سے کچھ اس اہم عہدے پر فائز ہونے کی تعلیمی قابلیت بھی نہیں رکھتے ہیں۔ قومی ترقیات میں کمیونٹی پروجیکٹ کو اہم پوزیشن حاصل ہو گئی ہے۔ خاص کر جو ممالک بنیادی طور پر زراعتی ہیں لیکن یہاں ایسا معلوم پڑتا ہے جیسے یہ محکمہ کچھ آدمیوں کو پالنے کا ایک ذریعہ ہو اس طرح سے وقت اور عوامی سرمایہ کو ضایع کیا جا رہا ہے" سلہ

سیلاب کی ناگہانی مصیبت سے جو کچھ متباہ کاری ہو جاتی اور سیلاب زدگاں کی امداد کے لئے جو رقوم مخصوص یا جمع کی جاتیں وہ بھی عام طور پر حق داروں تک نہیں پہونچتیں اور بڑی بے دردی سے ان رقوم کا بھی خورد وبرد کیا جاتا۔

"علاقہ نارہ بل کے عوام کے لئے پچھلے سال سیلاب کے دنوں میں امدادی فنڈ ارسال کیا گیا تھا اور یہ روپیہ ایک ممبر اسمبلی کے حوالہ کیا گیا تھا مگر یہ روپیہ ہضم کر لیا گیا۔ اس سلسلے میں لوگوں نے بڈگام کے تحصیلدار کے پاس تحریری شکایت بھی بھیجی تھی۔ تحصیلدار نے ممبر اسمبلی...... کے خلاف سمن بھی جاری کئے مگر سب بے سود ـــــــ۔

یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا کہ جب وہ لوگ جنہیں عوام کی نمایندگی کا دعویٰ ہے، اس قسم کا رویہ اختیار کرینگے۔ تو سرکاری اہل کاروں کا کیا حال ہوگا؟ - اس کی بھی ایک تازہ مثال ہمارے سامنے ہے۔ اس بار سیلاب کے بعد تورامباغ کی فیکٹری کے بنڈ کا شگاف، مزدوروں کی مشترکہ کوششوں سے بند کر دیا گیا۔ مزدوروں نے باہر کے احاطے سے مٹی لاکر بنڈ کی مرمت کر دی ایریگیشن یا محکمہ رفاہ عامہ کے ملازمین نے اس کام میں کوئی حصہ نہیں لیا مگر محکمہ کے اہل کاروں نے اس مرمت کے لئے فرضی بل پیش کر دئے جبکہ نہ تو یہاں کے بنڈ کے لئے مٹی ہی خریدنی پڑی اور نہ ہی مزدوروں پر ہی کچھ خرچا پڑا۔ مزدوروں نے سارا کام رضاکارانہ طور پر کیا۔

سلہ ریاستی پرجا سوشلسٹ پارٹی کا اعلان ... ۱۹۵۷ء

عوامی حلقوں نے اس خبر پر تشویش کا اظہار کیا ہے اور وہ اس بات کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ اس کیس کی فوری جانچ پڑتال کی جائے اور ایسے سرکاری افسروں کے خلاف سخت کاروائی کی جائے جو کہ سرکاری خزانے کو بے دردی سے لوٹ رہے ہیں - ایک طرف کشمیر کے سرکاری اہلکاروں کا یہ حال ہے کہ وہ سرکاری خزانے اور عوام کے لئے جو فنڈ مخصوص کئے جا رہے ہیں ان کی لوٹ کے مواقع ناڈ رہے ہیں - دوسری طرف ہند فوج کے جوانوں نے سیلاب زدگان کی ہر ممکن امداد کی لوگوں کو کھانا، کپڑے اور ادویات مہیا کیں ۴ ۵۱

جب ایڈمنسٹریشن صاف ستھری نہ رہ سکی تو ضابطے اور قاعدے، قانون بے معنی ہو کر رہ گئے، قدرتی طور کرپشن اور روپے کے خورد برد کی وارداتیں ہر شعبے میں بڑھتی گئیں۔

"جموں شہر میں نئے راشن کارڈ بنانے کے موقع پر مختلف نیشنل کانفرنس کارکنوں (جو اکثر راشن ڈیلر بھی ہیں) نے محکمہ فوڈ اینڈ سپلائز کے کچھ متعلقہ ملازموں سے مل کر پچاس ہزار کے قریب لوگوں کے جعلی راشن کارڈ بنوا لئے ہیں - پتہ چلا ہے کہ اس سے پیشتر جموں شہر میں کل اسی ہزار کے قریب لوگوں کے راشن کارڈ بنے تھے - مگر اب نئے راشن کارڈ ایک لاکھ چالیس ہزار کے قریب لوگوں کے بنائے گئے ہیں - گویا راشن کارڈوں کی تعداد میں یکدم پچاس ہزار کے قریب نفوس کا اضافہ ہوا ہے" ۵۲

یہ اور بھی تعجب انگیز امر ہے کہ سرکاری روپیہ حکمران جماعت کو بطور عطیہ دیا گیا ہے اور اس رقم کو تنظیمی کاموں پر صرف کیا گیا - پنڈت پریم ناتھ ڈوگرہ نے مارچ ۱۹۵۸ء کے اسمبلی سیشن میں حکومت کے خلاف اس الزام کو ثابت کیا اور ریاستی کینٹ آرڈر کے نمبر ڈیٹ کا حوالہ دیکر دکھایا کہ کس طرح حکومت نے ایک لاکھ تریسٹھ ہزار روپے غلط طور استعمال کر کے اس میں سے بیشتر رقم خفیہ طور پر نیشنل کانفرنس کو دیکر اس کے حق میں معاف کر دی ہے۔

۵۱ اخبار "کشمیر" سرینگر مورخہ ۶ ستمبر ۱۹۵۷ء ۵۲ اخبار "جے سودیش" جموں مورخہ ۱۳ فروری ۱۹۵۸ء

ہلسر گاٹا میسور میں ایک ڈیری فارم ہے جہاں ڈنمارک کی اعلےٰ نسل کی گائیں بھی ہیں، ہر ایک گائے اسی (۸۰) پونڈ روزانہ دودھ دیتی ہے۔ ان میں سے چار گائیں کشمیر سرکار کو ڈیری کے لئے بخشی وزارت کے دوران بھیجدی گئی تھیں۔ کشمیر سرکار نے ان گائیوں کی فرضی موت دکھائی اور چاروں کی چار ہی کچھ منسٹروں نے آپس میں بانٹ کر لے لیں۔ ریاست میں آسٹریلیا کے اعلیٰ قسم کے اون دینے والے بھیڑ نسل کشی اور مرینا اون دینے کے لئے سرکار نے زیر پرورش رکھے تھے ایک بار ایک منسٹر صاحب ریاست کے دورے پر آئے تو انکی خاطر تواضع کرنے کی خاطر مرینا اون دینے والے دو بھیڑ ذبح کر دئے گئے۔

ملازموں کی بھرتی اور انہیں ترقی دینے کے سلسلے میں بھی دھاندلی چلائی جاتی ہے۔ غیر مستحق اور نااہل آدمیوں کو سیاسی اغراض کے تحت یا منظور نظر ہونے کے ناطے بھرتی کیا جاتا ہے یا ترقی دیجاتی ہے۔

"شری دینا ناتھ ریونیو منسٹر نے اخبار نویسوں کے ساتھ غیر رسمی بات چیت کے دوران ایک سوال کے جواب میں اس بات کو تسلیم کیا کہ گورنمنٹ نے محکمۂ مال کے کچھ افسروں کو واقعی محکمانہ امتحان پاس کرنے سے مستثنیٰ قرار دیا ہے اور ان میں ایسے افسر بھی شامل ہیں جو اسی رعایت کے مستحق نہ تھے۔۔۔۔

۔۔۔۔ آپ نے اس بات کو بھی تسلیم کیا کہ گورنمنٹ کے پاس محکمۂ مال کے افسروں کی سینیارٹی کی کوئی لسٹ نہیں ہے۔ شری دینا ناتھ نے بات چیت کے دوران اس بات کا بھی اعتراف کیا کہ کئی صورتوں میں محکمہ مال میں پٹواریوں کے مقابلے میں نائب تحصیلداروں کی تعداد بڑھ گئی ہے" ؎۵۲

ایسے ماحول میں جو فی الواقع قابل اور دیانتدار افسر ہیں وہ پرزہ معطل کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور بسا اوقات اپنے جائز حقوق سے محروم ہو کر ترقی پانے سے محروم بھی رہ جاتے ہیں

"اگر کوئی افسر یا ملازم غیر جانبداری اور انصاف پر چلتا ہے تو اس پر طرح طرح کے الزام لگنے اور اس کے خلاف ریزولیشن پاس ہونے شروع ہو جاتی ہیں۔ انہیں ذلیل و خوار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر لوگوں کو انصاف

؎۵۲ اخبار "دیش سودیش" جموں مورخہ ۱۵ جنوری ۱۹۵۸ء

نہیں مل رہا ہے" ؎۵۱

ادنیٰ سے ادنیٰ سرکاری ملازموں کو بھی برسر اقتدار جماعت اپنی اعانت اور پروپیگنڈا کرنے کے لئے استعمال کر رہی ہے اور اس ضمن میں حلقہ پٹوار شیوہ تحصیل ڈوڈہ (حلقہ انتخاب اسمبلی بھدرواہ) کے پٹواری کی کارگزاری کے واقعاتی روز نامچہ میں منجملہ دیگر باتوں کے یہ بھی درج ہے

"نمبر شمار

۱۴۹ - ۱۵ مئی سنہ ۱۹۵۷ء / ۲ جیٹھ سمت ۲۰۱۴ ب بدھوار

امروز گرداوری بقایا موضع شیوہ نمبر خسرہ ۲۰۱ لغایت آخر کی گئی بوجہ زیادہ کام الیکشن کے اندراج واقعات پر گرداوری نہیں کئے گئے۔ زمینداران حلقہ کو جمع کر کے سمجھایا گیا کہ حکومت وقت کا ہمیشہ ساتھ دیتے رہیں.....

۱۵۰ - ۱۶ مئی سنہ ۱۹۵۷ء / 3 جیٹھ سمت ۲۰۱۴ ب ویروار۔

امروز چوکیداران دہ و زمینداران دہ ہندو مسلم کو موضع شیوہ کے روبرو گرداوری 300 لغایت 500 تک کی گئی اور بوجہ زیادہ کام نیشنل کانفرنس کے اندراج واقعات نہ کر سکا

۱۵۱ - 17 مئی سنہ ۱۹۵۷ء / 4 جیٹھ سمت ۲۰۱۴ ب شکروار۔

امروز نمبر خسرہ ۵۰۱ لغایت آخیر تک کی گئی اور تغیرات بوجہ زیادتی کام نیشنل کانفرنس کے اندراج واقعات نہ کر سکا۔ اس کے بعد پرچیات نیشنل کانفرنس خانہ نمبر ایک لغایت ۲۰۰ دن کو..... (لفظ پڑھا نہیں جاتا) کی گئی اور صبح ہی بدست ...... (لفظ پڑھا نہیں جاتا) بغرض تقسیم کی گئی" ؎۵۲

بخشی وزارت کے خاتمہ کے بعد صادق وزارت نے بھی وہی پرانی بے ہنگم چال جاری رکھی۔ صادق صاحب ایڈمنسٹریشن میں کوئی خاطر خواہ اصلاح نہ کر پائے اور موجودہ نقائص و خامیاں تسلی بخش طور پر رفع نہ کر سکے۔

"صادق نے روٹ پرمٹ کے طریق کار کو ختم کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن حال ہی میں ریاستی وزیر داخلہ نے سرینگر میں منعقدہ ٹرانسپورٹروں کی کنونشن میں اعلان کیا کہ روٹ پرمٹ سسٹم برقرار رہے گا۔ انہوں نے کورپشن کو ختم کرنے اور ایڈمنسٹریشن کو پاک کرنے کے بہت سے وعدے کئے تھے لیکن

؎۵۱ الگ ودھان ودروودھی کانفرنس، جموں میں پنڈت پریم ناتھ ڈوگرہ کا صدارتی بھاشن مورخہ ۲۳ ستمبر ۱۹۵۶ء صفحہ نمبر ۱۰، ۱۱
؎۵۲ اخبار "ستے سودیش" جموں۔ مورخہ 26 فروری سنہ ۱۹۵۸ء

لیکن حقیقت یہ ہے کہ آجکل ریاست میں کورپشن انتہا پر ہے، سیکرٹریٹ میں ملازمین کام کی نسبت سیاست میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ ترقیاتی سرگرمیاں رُک گئی ہیں۔ شیخ کی رہائی کے بعد صادق سرکار نے اس کے قریبی ساتھیوں اور سازش کیس میں ماخوذ ملزمان کو سرکاری ملازمت میں لے لیا اور نہ صرف ان کو کلیدی عہدوں سے نوازا گیا بلکہ انہیں سابقہ رقوم لاکھوں روپیہ کی صورت میں دیدیں۔ اس طرح سے صادق نے شیخ کا کھیل کھیلا" ؎۱

صادق صاحب کا عہد وزارت جہاں حرف گیری اور نکتہ چینی سے مبرا نہیں وہاں ان کی اپنی کارکردگی بھی قابل تحسین نہیں ہے۔ ان کے خلاف بھی الزامات کی ایک فہرست ہے۔ قانون سازیہ کے چودہ نیشنل کانفرنسی ممبروں نے بھی وزیر اعلیٰ صادق صاحب اور ان کے کچھ وزراء کے خلاف الزامات کی فہرست مرتب کر کے راشٹرپتی سے ان کی تحقیقات ایک کمیشن آف انکوائری سے کرانے کی گزارش کی تھی۔ اس میں ایک الزام یہ بھی عاید کیا گیا تھا کہ محکمہ کسٹوڈین نے صادق صاحب کے نام 63-5331 روپیہ بابت کرایہ بنگلہ و فرنیچر کا ڈیمانڈ نوٹس اس مدت کے لئے جاری کیا جب وہ منسٹر نہیں تھے، لیکن صادق صاحب نے وزیر اعلیٰ ہونے کے ناطے اپنے گھریلو نوکر کی تنخواہ بحساب چالیس روپے ماہوار ۱۹۵۳ء سے اس بنا پر مجرا دینے کی مانگ کی کہ انہوں نے نوکرِ متذکرہ کو بطور باغبان اس وقت کے ریوینیو منسٹر اور کسٹوڈین جنرل یعنی مسٹری میر قاسم کے زبانی کہنے پر متعین کیا تھا۔ اس مدت کے لئے مذکورہ باغبان کی تنخواہ 5353.33 روپے بنتی تھی۔ اس طرح سے وزیر اعلیٰ صادق صاحب کے کسٹوڈین کے ذمہ ہی 2015.70 واجب الادا نکالے۔ اس پر بعد میں کسٹوڈین کشمیر نے اپنی چٹھی ڈی او ر— نمبر 4015/ اے سی مورخہ ۴ جنوری 1965ء، وزیر اعلیٰ صادق صاحب کے پی۔ اے کے نام اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اس چٹھی کی نقل درج ذیل کی جاتی ہے۔

از دفتر کسٹوڈین ایویکیوز پراپرٹی کشمیر

ڈی۔ او۔ 4015/ اے سی مورخہ ۴ جنوری ۱۹۶۵ء

؎۱ صادق سرکار کے دو رخ ناشر نیشنل کانفرنس جموں۔

ڈیر حفیظ صاحب!

مہربانی کرکے آنریبل جی، ایم صادق کو بتا دیجئے کہ کسٹوڈین جنرل نے اس حکم کی توثیق کی ہے جس کی رو سے غلام قادر بٹ کو بمشاہرہ چالیس روپیہ ماہوار 6-8-1953 سے لیکر آخر دسمبر سنہ ۱۹۶۰ء تک بطور باغبان متعین کیا گیا تھا۔ یہ تنخواہ 33-35-35 روپے بنتی ہے۔ جس مدت میں آنریبل جی، ایم صادق منسٹر نہیں تھے اس عرصہ کے لئے مکان و فرنیچر کا زرکرایہ مبلغ 1531.63 روپے ان کے نام بقایا ہیں اس رقم کو حساب میں مجراء دینے کے بعد 2015.75 روپے اس دفتر کے ذمہ ان کی جانب سے بطور ایڈوانس ہیں اور یہ رقم مستقبل میں مجراء دی جائے گی۔

مہربانی کرکے اس چھٹی کی رسیدگی سے مطلع کریں

دستخط کسٹوڈین

ای، پی کشمیر

خواجہ اے حفیظ صاحب

پرسنل اسٹنٹ ٹو آنریبل جی، ایم صادق پرائم منسٹر (۱)

جیل ایڈمنسٹریشن تو بالکل افسوسناک ہے جیل خانوں نے پولیس کے تھانوں کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ سیاسی اور اخلاقی قیدیوں میں کوئی امتیاز نہیں ہے آجتک ۳۱ بار جیل جانے والے میجر محمد افضل خان نے اپنی حالیہ رہائی کے بعد جیل کے بارے میں اپنے تاثرات وزیراعلے مرحوم صادق صاحب کو یوں اپنے ایک خط میں بھیجے تھے۔

"یہ انتہائی بدقسمتی کی بات ہے کہ ریاست میں جیلوں کا نظام محکمہ صحت سے الگ کرکے براہ راست وزارت داخلہ اور پولیس کے کنٹرول میں دیدیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسی خطرناک بات ہے جسکو غیر معقول کہے بغیر چارہ نہیں۔ پولیس کے ماتحت جیلوں کا نظام آنے سے جیل خانے پولیس تھانوں میں تبدیل ہوگئے ہیں ...... آجکل جیلوں میں اخلاقی اور سیاسی قیدیوں کی تمیز ہی اٹھ گئی ہے ......

(۱) میمورنڈم ٹو دی پریذیڈنٹ آف انڈیا صفحہ ۲۳

—— کھانے پینے کے معاملے میں نظربندوں کو سخت تکالیف سے دوچار ہونا پڑتا ہے —— ایک نظربند کو جو کچھ ملنا چاہئے اس کا پچاس فی صدی حصہ جیلوں مختلف حکام ہڑپ کر جاتے ہیں۔ رہائی پانے پر رہا شدہ نظربندوں کا بستر وغیرہ دوبارہ کیا کئی بار قیمتاً نئے نظربندوں کو چارج کیا جاتا ہے [۹۱]

میجر افضل نے دوسرے پمفلٹ میں لکھا ہے "جیل حکام نے مجھ سے کہا کہ نظربندی کے ایام میں جو اشیاء میں نے اپنے اخراجات میں کٹوتی کر کے تیار کی ہیں وہ میں جیل سے باہر نہیں لے سکتا۔ نظربندی کے ایام میں اور کچھ چیزوں کے علاوہ میں نے ایک کمبل اور اپنے بستر کے لئے ایک چادر اور کچھ دوسری استعمال کی چیزیں بنوائی تھیں۔ جیل کے حکام نے انہیں باہر لیجانے کی اجازت نہیں دی (بعد میں مصدقہ طور معلوم ہوا کہ یہ اشیاء اور ایسی دوسری چیزیں نظربندوں کی رہائی کے بعد حاکمان جیل اپنے ذاتی استعمال میں لاتے ہیں" [۹۲]

ریاست جموں وکشمیر انتظامیہ کے لحاظ سے اندھیر نگری چوپٹ راج کا نقشہ پیش کرتی ہے، مختلف محکموں کے کاموں میں کوئی ہم قدری نہیں ہے اور جو کام جس وقت اور جہاں ہونا چاہئے وہ ہوتا نہیں ہے۔ اس کی ایک دلچسپ مثال بیان کرتا ہوں۔ عیدگاہ کے نزدیک موضع یار پورہ تحصیل خاص میں حکومت نے زمین کی آبپاشی کے لئے ایک واٹر پمپ سٹیشن تعمیر کیا ہے اس کے آس پاس کچھ ایسی زمین بھی ہے جو مقابلتاً پست سطح پر واقع ہے اور جسے سوکھے میں بھی پانی کی قلت نہیں رہتی ہے بلکہ اس زمین کی پیداوار کو اگر کبھی نقصان پہونچتا ہے تو پانی کی قلت کی وجہ سے نہیں بلکہ پانی کی زیادتی کی وجہ سے۔ جب یہ واٹر پمپ نصب کیا جانیوالا تھا تو اس علاقہ کے تمام باشندوں سے کہا گیا کہ پانی کی بہم رسانی کے لئے انہیں اپنی زمین کے مطابق حکومت کو معاوضہ کے طور پر سالانہ آبیانہ ادا کرنا پڑیگا۔ اس پر کچھ ان زمینداروں نے شور اٹھایا جن کی زمین کو پانی کی قلت نہیں ہے بلکہ پانی کی زیادتی سے ان کی فصل پیداوار کو نقصان ہوتا ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اس کے بعد محکمہ مال کے متعلقہ ملازمین اور متعلقہ محکمہ آبپاشی کے افراد نے کئی

---

[۹۱] صادق صاحب آپ کیوں جیل نہیں گئے؟ میجر محمد افضل خان یکم جولائی ۱۹۷۱ء

[۹۲] "جنت کشمیر کے جہنم" میجر محمد افضل خان ستمبر ۱۹۷۱ء

بے وسیلہ دیہاتی زمینداروں سے جو کہ تقریباً تمام کاشتکاراں ہیں اس بنا پر پیسے وصول کئے کہ ان کی اراضیات کو اس سکیم کی زد سے باہر دکھا کر ان کو آبیانہ کی چھوٹ دی جائے گی۔ مجھے مزید بتا یا گیا ہے کہ اس طرح سے جمع کی ہوئی رقم متعلقین نے آپس میں تقسیم کرکے ہڑپ کرلی اور باقی ایسے زمینداراں جنہوں نے واجب طور ہی آبیانہ سے چھوٹ حاصل کرنے کیلئے نذرانہ پیش کیا اور جنہیں حقیقتاً آبیانہ کی زد سے مبرا ہونا چاہیئے تھا، کے نام بھی آبیانہ اندراج کیا گیا اس طرح سے تحصیلدار شہر خاص کو اس آبیانہ کی رقم کو وصول کرنے کے مطلق العنانہ اختیارات مل گئے ہیں۔ جو کہ حقایق کی روشنی میں حرف بعید از انصاف ہوگا بلکہ جبر و تشدد اور رشوت ستانی پر محمول ہوگا۔ اس کارستانی کے شکار خاص کر موضع دیدہ مری، باغ سعید پورہ تحصیل خاص کے زمینداراں ہونے والے ہیں۔

ہندوستان کے کئی صوبوں کی حکومتوں نے ذریعہ آمدن بڑھانے کے لئے اور رفاہ عامہ کے کاموں کو تقویت دینے کے لئے لاٹریاں شروع کیں اس دیکھا دیکھی ریاست جموں و کشمیر کی سرکار نے بھی لاٹری شروع کی۔ لوگوں سے روپیہ بٹورنے والا یہ محکمہ بھی بدعنوانیوں اور دھاندلیوں سے پاک وصاف نہ رہ سکا نتیجہ یہ نکلا کہ ریاستی لاٹری کو بند ہونا پڑا۔

ان دھاندلیوں میں سے میں ایک واقعہ بیان کرنا ہوں، ایک بار اوّل انعام پر جھگڑا پڑ گیا اس انعام پر ایک ریاستی باشندہ نے اپنا حق جتلایا۔ مجھے ایک واقف کار حلقہ سے پتہ چلا کہ اس خود ساختہ حقدار کی ٹکٹ میں اس قرینے سے انعامی نمبر جوڑ دیا گیا تھا کہ شک کی کم ہی گنجایش رہی تھی۔ جنرل جول نول کرکے اس پر جھگڑا پڑ گیا اور اس انعامی ٹکٹ کو مشکوک تصور کیا گیا لیکن ریاستی سرکار اس خود ساختہ حقدار کو پہلا انعام دینا چاہتی تھی اس لئے اس کے "حق" پر مہر تصدیق ثبت کرانے کے لئے پھلور کے ماہر کو یہ ٹکٹ انعامی بغرض جانچ پڑتال و رپورٹ بھیجدی۔ اُس نے ایک بھی نہ مانی اور ٹکٹ کو جعلی قرار دیدیا۔ چونکہ حکومت کی دل چسپی

مذکورہ "حق دار" ہی تھی اس لئے سرکار نے ایکسپرٹ کو پھلور سے بیان منگایا اور مذکورہ ٹکٹ کو جائز اور صحیح قرار دینے کے لئے کہا لیکن اُس نے اپنے اوپر یہ ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے فن کا مظاہرہ کرکے حکام کو دکھا دیا کہ مذکورہ ٹکٹ جعلی اور بناوٹی ہے۔ یہ سب کچھ لوگوں کو بے خبر رکھ کر خفیہ طور ہوا۔ اور اس کے بعد بھی کشمیر لاٹری چالو رہی لیکن ان حالات میں آخر کتنی دیر تک چالو رہتی؟ بے گناہ لوگوں کے ساتھ دھوکا اور دغا کیا جاتا رہا جب پانی سر سے گذر گیا تو پولیس نے دھاندلیوں کی تحقیقات شروع کر دی، لاٹری دفتر کو زیر قفل کیا اور کئی ملازم حراست میں لئے گئے

" پولیس کی تحقیقات کے مطابق لاٹری محکمہ کے ملازموں نے انعامی ٹکٹ رکھنے والوں کو انعامات سے محروم کیا ہے اور بازار میں جعلی ٹکٹیں فروخت کی گئیں"[1]

ان سنگین اور کھلے عام دھاندلیوں کے پیش نظر عوام نے وزیر متعلقہ سے استعفیٰ پیش کرنے کی مانگ کی تھی لیکن بے سود

کسی بھی محکمہ کو اگر لیجئے تو ایسا لگتا ہے کہ بے توجہی اور لاپروائی سے کام کیا جاتا ہے۔ لاء سیکریٹریٹ کو ہی لیجئے سرکاری مقدموں کی پیروی کرنے کیلئے وکیلوں کی شرح فیس یا تو غیر مکتفی ہے یا غیر منطقی ہے جس سے بے انصافی ہونے کا احتمال ہے۔ مثال کے طور پر لیجئے کہ سرکار نے کسی فرد سے اُس کی ملکیتی زمین حاصل کی اور اس زمین کے معاوضہ میں بیس ہزار روپیہ سرکار نے منظور کئے جس پر مالک زمین رضامند نہیں اور وہ زیادہ معاوضہ کے حصول کے لئے حکومت کے خلاف عدالت میں مقدمہ ٹھوک دیتا ہے اور چالیس ہزار روپیہ بطور معاوضہ طلب کرتا ہے۔ اگر مالک زمین مقدمہ ہارتا ہے تو سرکار کی جانب سے پیروی کرنے والے ایڈوکیٹ صاحب کو بیس ہزار روپے پر سرکار زرِ محنتانہ ادا کریگی اور اگر مالک زمین مقدمہ جیت گیا اور چالیس ہزار روپے کی ڈگری ہو گئی تو سرکار اپنے وکیل صاحب کو چالیس ہزار روپے پر زرِ محنتانہ ادا کریگی۔ بہ الفاظ دیگر یہ شرح فیس

---

[1] اخبار "اکنامک پوسٹ" سرینگر مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۱ء

سرکاری وکیل کو مقدمہ ہارنے میں زیادہ مالی فائیدہ پہنچانے کی دلالت کرتی ہے اور مقدمہ جیتنے کی صورت میں کم - ظاہر ہے کہ مقدمہ ہارنے میں سرکاری وکیل کو زیادہ لالچ دی گئی ہے - لاسیکرٹریٹ نے آجتک ایسی اہم باتوں کی طرف غور کرنے کی کبھی زحمت ہی گوارا نہیں کی ہے کئی بار سرکاری مقدمات کے ساتھ دیگر افراد کے مفادات افریق مقدمہ نہ ہوتے ہوئے بھی گہرے طور پر وابستہ ہوتے ہیں لیکن لاپروائی سے وہ مفادات تلف ہوجاتے ہیں - اور نہ کوئی پوچھنے والا نہیں - سرکاری محکموں اور مقدموں کی پیروی کیلئے کسی وکیل کی تقرری ذاتی پسند اور ناپسند پر منحصر ہے -

لاپروائی اور بدنظمی ریاستی محکموں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ مرکزی محکمے بھی اس لت سے آزاد و پاک نہیں ہیں - یہاں کے محکمہ ٹیلیفون کو ہی لیجئے اس نے ٹیلیفون والوں کی ناک میں دم کر رکھا ہے اور وہ ٹیلیفون کو ایک بدعت اور مصیبت سمجھنے لگے ہیں - جعلی بلوں کی بھرمار، اور ٹیلیفون کا مالکِ ٹیلیفون کی اجازت کے بغیر ناقابل شناخت طریقے پر بے دردانہ استعمال، جہاں ٹیلیفون رکھنے والوں کے لئے مالی پریشانی کا باعث بنتی ہیں وہاں یہ چیزیں ان کی ذہنی کوفت کا بھی باعث بنتی ہیں - اس صورت حال کو دیکھکر یہاں کے ٹیلیفون رکھنے والے ہراساں و پریشان ہوگئے اور شری پُشکر ناتھ کول وکیل کی سرپرستی میں "آل کشمیر ٹیلیفون سبسکرائبرس ایسوسی ایشن" نامی جماعت کی تشکیل کی گئی اور گرینڈ ہوٹل سرینگر کے مالک خواجہ غلام محمد اس کے پریذیڈنٹ چنے گئے اور میں جنرل سیکرٹری مقرر ہوا - ٹیلیفون دنوں تک اکثر خراب رہتے ہیں اور کوئی پوچھنے والا تک نہیں

ڈاک کی شرح ٹکٹ میں جو کچھ ہی مدت پہلے اضافہ سارے ہندوستان میں ہوا نہ جانے کس غیر منطقی بنیاد پر ریاست جموں و کشمیر کو اس کے زیر بار نہیں لایا گیا اور یہاں اسے چھوٹ دیدی گئی لیکن عملاً یہ یہاں کے لوگوں کے لئے چھوٹ نہیں بلکہ مصیبت ثابت ہوگئی ہے - یا تو ریاست سے باہر ملک کے کسی حصہ کو چٹھی پتر ڈالنے والے کو مطلوبہ ایزاد ٹکٹ لگانی ہے تب جاکے اس کی چٹھی بغیر کسی مشکل کے منزل مقصود پر دی جائیگی، نہیں تو یہ ایک مدت کے بعد واپس آئے گی - میں نے دیکھا ہے کہ جن چٹھیوں پر سرینگر کی ڈاک مہر لگی ہے - اور چٹھی

بھی جاتی ہے، وہ چٹھیاں بھی بیرنگ ہو کر ملک کے کچھ حصوں سے مدت کے بعد واپس آتی ہیں اور مقامی ڈاکخانہ والے خرمستی سے چٹھی واپس کر کے بیرنگ پیسے طلب کرتے ہیں۔ اس افراتفری سے یہاں کی کتنی اہم چٹھیاں وقت پر باہر تقسیم نہ ہو کر واپس آچکی ہونگیں اور اس کی وجہ سے کتنے ہی لوگوں کا کتنا نقصان ہو چکا ہوگا کچھ کہا نہیں جاسکتا ہے۔

ریڈیو کشمیر سرینگر کے بارے میں کچھ نہ کہنا ہی مناسب سمجھتا ہوں۔ البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ ریڈیو کشمیر جہاں خالص حکومت کا ڈھنڈورچی بنا ہوا ہے، وہاں اس کے پروگراموں میں عام طور پر متعلقین کے خاص احباب کو ہی دعوت شرکت کا امتیاز حاصل ہے



معاشی حالات اور منصوبہ جات

ریاست جموں و کشمیر معاشی لحاظ سے ایک پسماندہ ریاست تھی۔ مرکزی سرکار نے اسے اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہونے کیلئے کروڑوں روپیہ کا امدادی قرضہ دیدیا۔ اور اب بھی بدستور حکومت ہندوستان کی مالی اعانت جاری ہے۔ تاکہ باقی صوبوں کی طرح یہ ریاست بھی اپنے پانچ سالہ منصوبوں کو عملی جامہ پہنا کر اپنی اقتصادی حالت کا سدھار کر سکے۔

یکم اپریل ۱۹۵۶ء کو ریاست کا پہلا پانچ سالہ منصوبہ اختتام پذیر ہوا۔ اور دوسرا پانچ سالہ منصوبہ شروع ہوا۔ پہلے منصوبہ پر ریاست کو ۱،۲۴۴۶۹۰ لاکھ روپے خرچ آئے۔ اس میں سے کوئی ۹۰،۷۶۶۳ لاکھ روپے مرکزی سرکار نے سود پر بطور امدادی قرضہ دیدئے۔ چونکہ ریاستی بجٹ پانچ سالہ منصوبوں کے اخراجات کا متحمل ہونے کے قابل نہیں ہے۔ اس لئے حکومت ہندوستان نے باقی ریاستوں کی طرح ریاست جموں و کشمیر کو بھی امدادی قرضہ فراہم کردیا۔ قرضہ پر حاصل کی گئی رقوم کو تعمیری اور ترقیاتی کاموں پر اس طرح سے لازمی طور استعمال کرنا واجب تھا۔ کہ آیندہ ریاستی سرمایہ میں اضافہ ہوکر منافع بخش بجٹ بن سکے۔ نہیں تو کم از کم خسارہ کا بجٹ متوازن ہو جائے۔ اس لئے تمام دستیاب ذرائع کو استعمال کرکے ان کو وسیع تر کرنا مناسب تھا۔ اس سے ایک تو عوام کا معیار زلیست اونچا ہو جاتا۔ تو دوسرا حاصل شدہ قرضہ کی رقوم مناسب سود کے ساتھ ادا کی جا سکتیں۔ ان منصوبوں کو ترتیب دیتے وقت ان امور کی طرف دھیان رکھنا ضروری تھا۔ لیکن عرق ریزی کی گئی تو ایسی باتوں پر جن سے اتنی آمدن کی توقع نہیں ہو سکتی۔

مشاہدے سے پایا گیا ہے کہ ریاستی بجٹ عام طور پر مبنی بر حقائق نہیں ہوتا ہے۔ دکھاوے کے طور پر ظاہر کیا جاتا ہے کہ آمدن میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ مرکز کو سونپے گئے امور کے عوض میں ریاست کو ملنے والی گرانٹ ان ایڈ کی رقم کو آمدن کے ساتھ ملا کر مقامی آمدن میں اضافہ دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۵۴ء کا بجٹ لیجئے۔

"۵۶۱٫۷۳ لاکھ روپے کے نظر ثانی شدہ تخمینہ کے مقابلے میں اصلی آمدن ۵۵۴٫۴۳ لاکھ روپے تھی۔ رقموں میں فرق ۳۷٫۵۵ لاکھ روپے کا اضافہ اور ۴۴٫۸۵ لاکھ روپے کا خسارہ ظاہر کرتا ہے۔ اس طرح سے کل ۷٫۳۰ لاکھ روپے کی کمی ہو جاتی ہے۔ ۳۷٫۵۵ لاکھ روپے کا اضافہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ یہ پچھلے بقایہ جات کی جمع شدہ رقم ہے۔ خسارہ مبنی بر حقیقت ہے اور اہم ہے۔ اور مالیہ اراضیات میں ۱۸٫۳۰ لاکھ روپے۔ سریکلچر میں ۵٫۶۷ لاکھ روپے ہے۔ اور سود اور منافع میں ۷٫۴۰ لاکھ روپے واقع ہوا ہے۔ اصل خرچہ نظر ثانی کئے ہوئے ۵۴۲٫۶۳ لاکھ روپے کے تخمینہ کے مقابلے میں اصلی خرچ ۵۱۱٫۸۵ لاکھ روپے ہے۔ رقموں میں فرق سڑکوں اور بجلی وغیرہ پر ۲۳٫۰۴ لاکھ روپے کا مزید خرچہ دکھاتا ہے۔ اور چند ایک حقیقی ترقی بخش منصوبوں کی وجہ سے ۵۳٫۸۲ لاکھ روپے کی بچت کو روبہ عمل نہیں لایا گیا ہے۔ آمدن اور اخراجات میں اتنا بڑا فرق خاصکر منصوبہ کے بجٹوں میں اس بات کا مظہر ہے کہ کتنا غلط اور بعید از صداقت ہمارا بجٹ ہوتا ہے اور حکومت کس حد تک پلان کے مجوزہ نشانوں کو حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے۔"[1]

اسی طرح فرضی واقعات اور اعداد و شمار دوسرے بجٹوں کے بھی خاصہ ہیں۔ اخراجات میں مشینری وغیرہ خریدنے کی تفصیلات نہیں دی جاتی ہیں۔ اس لئے جہاں اصلیت کا اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہاں عام طور پر اعداد و شمار قابل باور نہیں لگتے ہیں۔ ۱۹۵۵-۵۶ء کے بجٹ کی پوزیشن مندرجہ ذیل تھی۔

"آمدن کے ابتدائی تخمینہ جات جو ۵۸۲٫۶۲ لاکھ روپے تک پہونچتے ہیں کو نظر ثانی کئے ہوئے تخمینہ میں ۵۹۳٫۲۰ لاکھ روپے تک بڑھا دیا گیا ہے۔ جس سے کہ ۱۰٫۵۸ لاکھ روپے کا اضافہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ رقموں میں فرق ۲۶٫۲۷ لاکھ روپے کا اضافہ دکھاتا ہے۔ یہ اضافہ خصوصی طور پر جنگلات سے وصولی کے باعث ہے جو رائلٹی کے طور پر ایڈوانس کی وصولی اور عمارتی لکڑی کی اونچی قیمت پر فروختگی کا نتیجہ ہے۔

[1] "بجٹ جگلری آف جموں و کشمیر" گردھاری لال آنند صفحہ نمبر ۶، ۷

۱۵،۶۹ لاکھ روپے کا خسارہ بھی ہے جو زیادہ تر سریکلچر، ایکسائز اور اراضیات کے مالیہ میں ہے۔ خسارہ مبنی بر صداقت ہے۔ جب کہ اضافہ محض دکھاوا۔

ابتدائی تخمینہ جات کے مطابق ۵۵۰،۲۲ لاکھ روپے اخراجات ہیں۔ جو کہ اب نظر ثانی شدہ تخمینے پر ۶۱۸،۳۱ لاکھ روپے تک بڑھا دیئے گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے اس میں ۶۸،۰۹ لاکھ روپے کا اضافہ ہوا ہے۔ اخراجات کے بارے میں ابھی صحیح اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں۔ لیکن ۷۷،۸۰ لاکھ روپے کے دکھائے گئے اضافہ کی یہ وجہ بیان کی جاتی ہے۔ کہ کئی ترقی رسان اسکیمیں اس سال کے دوران میں منظور کی گئیں۔ لیکن جو کہ درحقیقت زیادہ تر سود، ریاستی محکموں جنرل ایڈمنسٹریشن اور متفرقات کی بناء پر ہے۔ ہم نیچے ان وجوہات کا حوالہ دیتے ہیں۔ جو کچھ مدوں پر اخراجات میں اضافہ ہونے کے بارے میں پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ سود کے تحت اضافہ کی وجہ حکومت ہند سے لیا گیا واجب سود قرضہ ہے

۲۔ اہم ترین شخصیتوں کی ایک بڑی تعداد نے ریاست کا دورہ کیا۔ اس لئے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے تحت ۴،۴۶ لاکھ روپے کا اضافہ ہوا ہے۔

۷۔ روڈس و بلڈنگس کے محکمہ کے تحت بڑی تعداد میں ترقیاتی کاموں (جو کہ پلان میں درج نہیں تھے) کو روبعمل لانے پر ۹۸،۱۱ لاکھ روپے کا اضافہ ہوا ہے۔

۸۔ سریکلچر ڈیپارٹمنٹ کے مزدوروں کو بونس دیا گیا ہے۔

ہم اس بات کا فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں۔ کہ کیا یہ اضافہ ترقی پرور اقدامات کی بناء پر ہوا ہے؟ اور کہ کیا قرضہ کی رقم باہر سے آئے ہوئے اہم اصحاب کی خاطر تواضع کیلئے خرچ کی جانی چاہئے تھی؟ اور کیا اس فیکٹری کو بونس دیا جانا موزون تھا جو بدستور خسارہ پر چل رہی ہے؟ محکمہ سڑک و تعمیرات کے تحت اضافہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ کس حد تک حکومت پلان پر عمل پیرا ہے۔ اور پلان کے مخصوص ترجیحی کاموں پر کس قدر کاربند ہے۔ اور یہ بھی کہ کس طرح ہمارے اخراجات حکمرانوں کے

وہم و گمان کے تابع ہیں ؟

اخراجات میں کمی بنیادی طور نیشنل ایکسٹنشن سروس پروگرام کو پوری طرح عملی جامہ نہ پہنانے کی وجہ سے واقع ہوئی ہے اور اس اہم پروگرام کو عملی جامہ نہ پہنانے کی کوئی وجہ نہیں دیدی گئی ہے۔ غالباً اسے اتنا فائدہ رساں تصور نہ کیا گیا تھا۔ جتنا کہ اہم آدمیوں کی خاطر تواضع کرنا" لہ

سنہ ۱۹۵۶-۵۷ء کا ریاستی بجٹ بھی درحقیقت خسارہ کا بجٹ تھا۔ پہلے پانچسالہ پلان کے تحت مکمل کئے گئے کاموں کو قائم رکھنے کیلئے مزید اخراجات برداشت کرنا پڑے۔ اس طرح سے آمدن میں اضافہ ہونے کی بجائے اخراجات میں ہی اضافہ ہوتا گیا۔ ادھر سے اخراجات میں اضافہ کی وجہ بڑے کاموں پر خرچ کو قرار دیا جاتا ہے۔ جبکہ حقیقت میں اخراجات کی اس ایزادگی میں بڑے کاموں کیلئے کوئی رقم وقف نہیں ہوتی ہے

"تخمینہ شدہ خرچ ۷،۰۶،۱۷ لاکھ روپے کے مقابلے میں آمدن کا تخمینہ ۶۷۳،۶۷ لاکھ روپے لگایا گیا ہے۔ اس طرح سے ۳۲،۵۰ لاکھ روپیہ کا خسارہ، سنہ ۱۹۵۴-۵۵ء میں ۴۲،۵۸ لاکھ روپے کے حقیقی سرپلس اور سنہ ۱۹۵۵-۵۶ء میں تخمینہ شدہ ۳۲،۴۰ لاکھ روپے سرپلس کے باوجود پڑ جاتا ہے۔

۷،۰۶،۱۷ لاکھ روپے کے متوقع اخراجات سنہ ۱۹۵۵-۵۶ء کے ۶۱۸،۳۱ لاکھ روپے کے اخراجات سے ۸۷،۸۶ لاکھ روپے زیادہ ہیں۔ اور یہ اضافہ ۵۳،۱۴ لاکھ روپے پولیس، ایکسایز اور جنرل ایڈمنسٹریشن پر، ۱۹.۹ لاکھ روپے بجلی اور آبپاشی پر اور باقی تعلیم، صحت وغیرہ پر خرچ ہونے کی وجہ سے ہوا ہے۔ یہ بات نوٹ کرلی جائے کہ مذکورہ اضافہ شدہ خرچہ کسی مجوزہ ترقیاتی سکیم کے باعث نہیں ہے۔ بلکہ خالص پہلے پانچسالہ پلان میں مکمل کئے کاموں کو بحال رکھنے کیلئے مقرر شدہ اخراجات کے اوپر ہے۔ اس لئے ۷،۰۶،۱۷ لاکھ روپیہ کے خرچہ میں کوئی رقم بڑے کاموں کیلئے نہیں ہے" ۲

بجٹ کو غالباً پوری ذمہ داری کے ساتھ مرتب نہیں کیا جاتا رہا ہے۔ فرضی اعداد و شمار کا جابجا استعمال ملتا ہے۔ کئی اہم اعداد و شمار آپس میں نہیں ملتے ہیں

لہ "بجٹ جگلری آف جموں و کشمیر" ؛ گردھاری لال آنند

ٹ " بجٹ جگلری آف جموں و کشمیر" گردھاری لال آنند صفحہ ۱۱۱

جیسے بجٹ کے فرضی، ناقص، نامکمل اور ناقابل باور ہونے کے اندیشہ کو مزید تقویت ملتی ہے اور ریاستی سرمایہ کے آمدن و مصرف کی نسبت حقیقت کا پورے طور سے پتہ نہیں چلتا ہے۔

سنہ ۵۷-۱۹۵۶ء کے طبع شدہ بجٹ کے بیان نمبر ایک صفحہ ۲ پارٹ ایک اور بیان نمبر ایک صفحہ نمبر ایک، پارٹ دو کے اعداد و شمار آپس میں نہیں ملتے ہیں۔ پارٹ ایک میں تمام متوقع وصولی ۳۶۶٫۷ لاکھ روپے دکھائی گئی ہے۔ اس میں مرکز کی طرف سے گرانٹ ان ایڈ (Grant in aid) کی صورت میں دئے گئے ۲۵۴٫۶۷۱ لاکھ روپے بھی شامل ہیں۔ جس کی وجہ سے مقامی ذرائع سے کل ۴۱۸٫۶۹۶ لاکھ روپے آمدن بن جاتی ہے جبکہ پارٹ دو میں ۶۸۲٫۱۴۱ لاکھ روپے کی وصولیات دکھائی گئی ہیں اس میں گرانٹ ان ایڈ کی ۲۵۴٫۶۷۱ لاکھ روپے کی رقم بھی شامل ہے اس کے علاوہ کمیونٹی پراجیکٹ اور نیشنل ایکسٹنشن پروگرام کیلئے مرکز کی طرف سے دئے گئے ۳۴٫۶۴۴ لاکھ روپے بھی شامل ہیں۔ نتیجہ کے طور پر مقامی ذرائع سے کل آمدن صرف ۳۵۲٫۶۶۷ لاکھ روپے رہ جاتی ہے۔ یہ ہمارے لئے جاننا بہت مشکل ہے کہ ان دو رقوم یعنی ۴۱۸٫۶۹۶ لاکھ روپے اور ۳۵۲٫۶۶۷ لاکھ روپے میں سے کون سی رقم صحیح ہے ....

دراصل اخراجات بڑھتے جاتے ہیں۔ اور آمدن میں نسبتاً اضافہ نہیں ہو پاتا ہے۔ بڑے اخراجات قرضہ کی رقوم سے پورے کئے جاتے ہیں اور ناقص سکیموں کی طرف متوجہ ہونے کے باعث ہم قرضوں کے رحم و کرم پر ہیں۔ آمدن میں حقیقی اضافہ بالکل برائے نام ہے۔ یہاں تک کہ یہ اس سود کی رقم کا ایک حصہ بھی نہیں جو ہم نام نہاد ترقی کی سکیموں کو عملی جامہ پہنانے کیلئے لائے گئے بہت بڑے قرضہ پر دیتے ہیں۔ اس اضافہ کی صرف توقع رکھی گئی ہے۔ اور اگر ہمارے بجٹوں کی سابقہ تاریخ کوئی رہنمائی کر سکتی ہے، تو وہ یہی ہے۔ کہ یہ تخمینے سال کے اختتام پر شاید ہی کبھی پورے ہو جاتے ہوں۔

سال سنہ ۵۷-۱۹۵۶ء کا بجٹ ایک اور لحاظ سے بھی اپنی نوعیت کا انوکھا بجٹ ہے۔ پہلا یہ "ان شروع ہونے سے پہلے ہماری آمدن کے

ایک بڑے حصہ کو ہمارے بڑے کاموں پر خرچ کیا جاتا تھا اور پلان کے دوران میں بھی ہمارے داخلی آمدن میں سے ۳۳۶٫۴۶ لاکھ روپے یا پہلے پلان کے کل مصرف ۱۲۴۴٫۹۰ لاکھ روپے کی ۲۷ فیصدی رقم اس کے لیے صرف کی گئی۔ ترقیاتی پروگرام کیلئے ہماری داخلی آمدن کا یہ حصہ سال رواں میں نفی پر آچکا ہے جو کہ دوسرے پلان کا پہلا سال ہے اور جس میں کہ تجویز کیا گیا ہے کہ بڑے اخراجات سالم طور پر قرضہ کی رقوم سے پورے کئے جائیں اور اندرونی آمدن ایڈمنسٹریشن اور دیگر کاموں پر مقرر شدہ اخراجات پر مکمل طور پر ختم کی گئی ہے۔ یہ ہماری مادی خوشحالی کا نمونہ ہے اور "اُس ترقی کا" جس پر کہ وزیر خزانہ اور دوسرے اصحاب فخر کرتے ہیں کہ "یہ پہلے ہمیں کبھی نصیب نہیں ہوئی ہے"۔ لہ

ریاست کا مالی انحصار مرکزی سرکار کے قرضوں کی فراہمی پر ہے۔ اِن قرضوں کے رحم وکرم پر ہی بڑے اخراجات پورے ہو جاتے ہیں۔

"سنہ ۶۵-۱۹۶۴ء کیلئے ریاستی اسمبلی میں پیش ہوئے آڈٹ رپورٹ کی رُو سے مرکز کا ۶ ، ۷ کروڑ روپیہ سے کچھ زیادہ قرضہ ۳۱ مارچ ۱۹۶۵ء تک کشمیر کے ذمہ ہے۔ وزیر خزانہ مسٹر جی۔ ایل۔ ڈوگرہ نے بتایا کہ ریاست نے ۳۱ مارچ ۱۹۶۵ء تک جو کل قرضہ حاصل کیا ہے۔ یہ اعداد و شمار اس کا ۸۷ فیصدی بنتے ہیں"۔ لہ

اپنی آمدن بڑھانے کیلئے ریاستی حکومت غیر واجب حربے استعمال کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتی ہے۔ چنانچہ

"حکومت جو سڑک کا ٹول ٹیکس لیتی ہے۔ وہ ناجائز ہے کیونکہ یہ سڑک قومی شاہراہ ہے اور ہندوستان کی مرکزی سرکار کے تحت ہے۔ مرکزی سرکار کہیں بھی کسی قومی شاہراہ پر سڑک کا ٹول ٹیکس وصول نہیں کرتی ہے۔ ریاست مرکزی امور پر ٹیکس نہیں لگا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ اور بھی غیر منصفانہ اور امتیازی امر ہے کہ یہ ٹیکس صرف کشمیر سے درآمد اور

لہ بجٹ جیولوجی آف جموں وکشمیر۔ شری گردھاری لال آنند سنہ ۱۹۵۷ء

لہ اخبار "انڈین ایکسپریس" نئی دہلی مورخہ ۱ نومبر سنہ ۱۹۶۶ء

برآمد ہونے پر لگایا گیا ہے جو کہ کشمیر کو جموں اور ہند یونین کے باقی حصوں سے جداگانہ حیثیت دینے کے مترادف ہے“ ۔ [1]

جموں سرینگر کی شاہراہ پر ریاستی سرکار کا کوئی خرچہ نہیں ہوتا ہے۔ اس کی دیکھ بھال اور مرمت کی ذمہ داری مرکزی سرکار پر عائد ہے۔ پچھلے کئی سالوں سے اس شاہراہ پر کروڑوں روپے حکومت ہند کو صرف ہوئے ہیں۔ اس بات کا انکشاف حکومت ہند کے ایک وزیر شری کرشن چندر پنت نے یہاں ایک پریس کانفرنس میں کرتے ہوئے کہا کہ

"آج کل ۲،۵ کروڑ روپیہ ہر سال جموں سرینگر شاہراہ کی بہتری پر خرچ کئے جاتے ہیں“ ۔ [2]

درحقیقت یہاں کے تجارتی اور روپے کمانے والے اداروں کی بھی حالت ابتر ہے بجلی آبپاشی اور پانی کی بہم رسانی کی اسکیمیں نقصان پر چل رہی ہیں۔ اگر منافع دے سکنے والے ادارے بھی ریاست کی آمدن بڑھانے کا موجب نہیں بنتے ہیں تو جب مالی امداد بند ہو جائیگی۔ تب ریاست کا سخت مالی اور اقتصادی سنکٹ سے دوچار ہونا غیر اغلب نہیں ہوگا۔

"ہم غذائی لحاظ سے خود کفیل نہیں ہیں اور انڈسٹری کے لحاظ سے بھی پسماندہ ہیں۔ ہماری تجارت کا توازن موافق نہیں ہے۔ ہم نے یہ دیکھا ہے کہ پانچ سالہ منصوبوں نے ان معمولی تکالیف کو دور کرنے کیلئے کیا کیا ہے۔ پانچسالہ منصوبہ نے یہ کیا ہے کہ روپے غیر پیداواری سکیموں پر ضایع ہو کر ہمارے قرضہ میں اضافہ ہو گیا۔ جس کے سود کی رقم ہم جلد ہی ادا کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ ہم مرکزی سرکار سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس مالی افراتفری کو دور کرے اور وہ اس کی تحقیقات کرنے کیلئے حقایق دریافت کرنے والی ایک صحیح قابل جماعت یہاں بھیج دے ..... یہ مرکز کا فرض ہے۔ کہ وہ ہمیں ایک صاف اور ستھری ایڈمنسٹریشن قایم کرنے میں مدد دے۔ اور قرضہ اور امدادی رقوم کا استعمال کر کے دے۔ جو کہ وہ یقینی پیداواری کاموں کیلئے بڑی فیاضی سے دیتا ہے اور ہمارے ذرایع آمدن کو بڑھا

---

[1] شری رام پیارا صراف کا مضمون بحوالہ اخبار "کشمیر" سرینگر مورخہ ۱۹/۲۰ اکتوبر ۱۹۵۷ء

[2] اخبار "ہندوستان ٹائمز" نئی دہلی مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۹۶۸ء

کر معیار زندگی کو بڑھا دے گی"۔ لہ

حکومت کو چاہیئے تھا کہ پانچ سالہ منصوبوں کی عوامی سطح پر تکمیل کیلئے عوام کا تعاون بھی حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی۔ اس سلسلے میں سیاسی پارٹیوں کو اعتماد میں لینا مناسب تھا۔ لیکن نہ جانے حکمرانوں نے کن مصلحتوں کے پیش نظر عوام اور مختلف سیاسی پارٹیوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اقتصادی منصوبوں کو بھی برسر اقتدار جماعت کیلئے ایک خالص سیاسی مسئلہ بنا کر اسے اپنے اقتدار کی بقا کے لئے استعمال کیا۔ ویلیج لیول ورکروں کی بھرتی اس ڈھنگ سے کی جاتی رہی کہ ان کا کوئی تعمیری کام نہ رہا۔ بلکہ ان کا شعبہ دوسرا "پیس بریگیڈ" بن کے رہ گیا۔ ترجیحی اہمیت کے مدوں کے مطابق اقتصادی منصوبوں پر عمل نہیں کیا گیا جن مدوں پر پہلے کام شروع ہو کے تکمیل پذیر کرنا لازمی تھا۔ ان کو سبقت حاصل نہیں ہوئی۔ اسلئے اقتصادی منصوبوں کے ساتھ عوام کو جو توقعات وابستہ تھیں وہ پوری نہیں ہو سکیں۔

وہ پانچسالہ پلانوں کو روبعمل لانے کا طریقہ پلان کا انتہائی بدترین پہلو ہے عوام کی صحیح اور جائز شمولیت نہ ہی پسند کی جاتی تھی اور نہ ہی حاصل کی گئی۔ پلان کی رقوم سے جو کام کئے گئے۔ وہ سیاسی اثر و رسوخ حاصل کرنے، پارٹی کو استحکم بنانے، موجودہ حکمرانوں کے حمایتی بنانے، اور لوگوں کو منفرد حیثیت میں یا گروپ وارانہ طور کورپٹ کرنے کے لئے کئے گئے۔ یونین اور کواپریٹو جیسے جمہوری ناموں کے تحت اجارہ داری حاصل کی گئی ہے۔ جن کو قائم کر کے زیادہ کنٹرول اور منافع کے زیادہ حصص حلقہ صدروں کو یا منسٹروں کے رشتہ داروں اور پارٹی کے دوسرے افراد کو ملتے ہیں...... ملازمت کا ہر کوئی شعبہ بداطوار اور کورپٹ ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ موافق ماحول کے بحال ہو جانے پر بھی اخلاقی بحالی کو کئی سال لگ جائیں گے...... ہم جو کچھ بھی مقامی آمدن سے بچائیں وہ حقیقی ترقیاتی کاموں پر صرف ہو جانا چاہیئے۔ ان میں ضروری طور پر ایسے منصوبے شامل ہوں۔ جن سے براہ راست اور

لہ "بجٹ جگری آف جموں اینڈ کشمیر" شری گردھاری لال آنند صفحہ ۵۰-۴۹

اور فوری طور ہماری مالی آمدن میں اضافہ ہو لیکن پھر بھی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ پلان کی رقوم میں سے بمشکل ۵۰ فیصد رقم ایسے منصوبوں پر خرچ کی گئی جن میں سے بیشتر غیر اقتصادی تھے اور ہماری مالی آمدن بڑھانے کی بجائے انتہائی نقصان کا موجب بن گئے۔ وہ منصوبے اپنے کام کے اخراجات، سود اور قیمت کے گھاٹے کے بھی متحمل نہیں ہوتے ہیں۔ ہمارا ملک زیادہ تر ایک دیہاتی ملک ہے۔ اور ہمارے عجیب موسمی حالات کے پیش نظر ہمارے زیادہ تر دیہاتی مزدور ہر سال پانچ مہینوں یعنی نومبر سے مارچ تک بے کار رہتے ہیں۔ پلان میں اس لئے زراعت پر اور امدادی پیشے اور معاون ذرائع سے مستقل روزی حاصل کرنے کے مواقع پر زور دیا جانا چاہیے تھا۔ جو ہمارے خاص پیشے سے مطابقت رکھتے یہ صرف چھوٹے پیمانے کی گھریلو دستکاریوں کی وجہ سے ممکن ہو سکتا ہے لیکن پھر بھی پلان نے اس بارے میں کچھ نہیں کیا ہے"۔ لہ

ہوشربا گرانی کی وجہ سے عوام الناس بے چین ہو گئے ہیں، اور معاشی بدحالی اور بے اطمینانی سے دوچار ہو گئے ہیں۔

"حکومت اپنے ترقیاتی منصوبوں کا دکھاوے کے طور پر خوب مظاہرہ کرتی ہے اور فیکٹریوں، تعلیمی اسکیموں اور کمیونٹی پراجیکٹ کے منصوبوں پہ بہت فخر کرتی ہے۔ لیکن ان منصوبوں کے پیچھے لوگوں کی زندگیاں نادار بنتی جا رہی ہیں اور پریشانیاں رس رس کر ان میں گھر کر رہی ہیں۔ قیمتوں میں کافی اضافہ ہونے کی وجہ سے عوام کے پہلے ہی پست معیار زیست میں ہوشربا کمی واقع ہو گئی ہے اور ایک بڑا حصہ غریبی کی حد سے گذرا ہی نہیں۔ بلکہ سخت ناداری کی حد سے بھی نیچے دھکیل دیا گیا ہے۔ بڑھتی ہوئی قیمتیں اور عام معاشی عدم تحفظ محنت کش لوگوں کی ترقی و خوشحالی کے دعاوی کا تمسخر

لہ "بجٹ جگلری آف جموں و کشمیر" شری گردھاری لال آنند ۱۹۶۷-۶۸

اڑاتا ہے۔ نچلے اور درمیانہ درجے کے لوگ آج غیر یقینی آمدنیوں اور بڑھتی ہوئی قیمتوں کے درمیان پسے جا رہے ہیں۔ اپنا پیٹ پالنے کیلئے حوصلہ شکن جدوجہد کرنے میں لوگ اخلاقی قدروں کو بھول رہے ہیں اور زندگی کرپشن میں گھر گئی ہے" ؎۱

ریاستی سرکار کے تخمینے، اعداد و شمار اور بیانات عام طور پر صحیح نہیں ہوتے ہیں۔ سرکار کی طرف سے جموں میں جاری کئے گئے پریس نوٹ مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۶۶ء میں ظاہر کیا گیا ہے کہ جموں و کشمیر انڈسٹریز لمیٹڈ چوتھے پلان کے دوران ورسٹارڈ سپننگ، وولن سپننگ، وغیرہ کو نئے ڈھنگ سے منظم کرنے اور دوسری فیکٹریوں میں پیدا کردہ مال کی مقدار بڑھانے اور ریشم کے بیج کی پیداوار میں مکمل خود کفالت حاصل کرنے کیلئے ۳۰.۴۸،۴۸ لاکھ روپے خرچ کرے گا۔ اگرچہ کچھ حد تک اس بارے میں مجوزہ سکیموں کو عملی جامہ پہنا کر کامیابی حاصل کی گئی۔ لیکن عام طور سے اس محکمہ نے اپنے خوابوں کو پورا کرنے کیلئے سنجیدہ اور مناسب کوشش نہیں کی۔ اور نہ ہی اطمینان بخش نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر پریس نوٹ مذکورہ کے صفحہ نمبر ۲ پر میچ فیکٹری بارہمولہ کے متعلق یہ درج ہے:۔

> "میچ فیکٹری بارہمولہ میں مال کی مقدار ۲۵۰ گروس میچ بکس سے بڑھا کر ۱۱۰۰ گروس میچ بکس یومیہ کی جائیگی .... فیکٹری کو وسعت دینے کیلئے چار لاکھ روپے خرچ کئے جائیں گے۔ جسمیں ۳،۲۵ لاکھ روپے نئی مشینری کی قیمت بھی شامل ہے"

اول تو اس فیکٹری میں ۱۹۶۶ء میں ۲۵۰ گروس میچ بکس یومیہ تیار نہیں ہوتے تھے۔ دوئم اس میں آج تک نئی مجوزہ مشینری نہیں لگائی گئی ہے۔ یہ فیکٹری مسلسل گھاٹا دکھا کر بند ہونے والی تھی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ۱۹۶۸ء کے آخر پر شری بی۔ این۔ زالپوری کو اس کا مینیجر مقرر کر کے اس کو بند ہونے سے بچایا گیا اور پرانی مشینری کے باوجود ان کی وجہ سے فیکٹری میں نمایاں ترقی ہو کر منافع ہونے لگا۔ شری زالپوری لکھتے ہیں:۔

؎۱ ریاستی پرجا سوشلسٹ پارٹی کا انتخابی منشور ۱۹۵۷ء

"یہ ساری مشینیں بہت پرانی ہیں۔ اور ۱۹۲۸ء سے بلکہ اس سے بھی پہلے سے زیر استعمال چلی آرہی ہیں .... دیگر امور میں جتنا بھی سدھار کرنا ممکن ہو سکا، کیا۔ اس کے علاوہ چالیس سال سے نصب شدہ اس گھسی ہوئی مشینری سے مندرجہ ذیل ترقی بھی حاصل کی ہے۔

'پچھلے سالوں کی اوسطاً یومیہ پیداوار کی مقدار ۱۶۴ گروس سے بڑھا کر ۲۲۵ء ۲۵۰ گروس یومیہ بنائی ہے۔' ۱؎

غذائی اعتبار سے ریاست کو خود کفیل بنانے میں کوئی ترقی نہیں ہوئی ہے۔ ریاست کے پانچ سالہ منصوبوں کے درمیان اس بارے میں جو کروڑوں روپے خرچ کئے جا چکے ہیں، ان کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور نہ ہی نسبتاً عوام کا معیار زندگی بلند ہونے میں مدد مل سکی۔ زرعی پیداوار بڑھانے کیلئے ایک کثیر رقم خرچ کی گئی۔ آبپاشی، زراعت اور افزائش نسل حیوانات پر فیاضی سے روپیہ خرچ کیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود بھی زرعی پیداوار میں حوصلہ افزا اور قابل تعریف اضافہ نہ ہوا۔ بلکہ زیر کاشت رقبہ میں اضافہ کی بجائے کمی واقع ہوگئی اور غلہ کی درآمد میں اضافہ ہوتا گیا۔

"حکومت جموں و کشمیر کی طرف سے شایع کئے گئے ایک کتابچے "جموں و کشمیر ریویو آف پراگریس، یکم جنوری ۱۹۵۶ء صفحہ نمبر ۲۳ پر درج ہے کہ ۱۹۵۲ء میں ریاست کی غذائی پیداوار میں ۴۲،۵۲،۰۰۰ من کی کمی تھی اور اس بات کا دعویٰ کیا گیا تھا کہ پہلے پانسالہ منصوبہ کے تحت ریاست کی غذائی پیداوار میں اس خسارے کو دور کیا جائیگا اور اس غرض سے آبپاشی، زراعت وغیرہ پر پلان کے مطابق کافی رقوم خرچ بھی کی گئیں۔ لیکن بجائے اضافے کے زرعی رقبہ اور پیداوار میں کمی ہوئی۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے ظاہر ہے۔

کل رقبہ زیر کاشت برائے اشیائے خوردنی:۔

۱۹۵۲-۵۳ء ... ۱۲۶۶۰۰۰ ایکڑ ۱۹۵۳-۵۴ء ... ۱۲۸۶۰۰۰ ایکڑ

۱؎ "سمال انڈسٹری ان کشمیر" دسمبر ۱۹۶۰ء شری بی۔ این۔ زالپوری صفحہ ۱۱-۱۶

۵۵-۱۹۵۴ء — ۱۱۲۰۰۰۰ ایکڑ — ۵۶-۱۹۵۵ء — ۱۱۳۵۰۰۰ ایکڑ

یہ اعداد و شمار حکومت ہند کی طرف سے شایع کئے گئے کتابچے "اگریکلچرل سٹیٹکس آف ری آرگنائزڈ سٹیٹس آف انڈیا" مورخہ ۳۰ جنوری ۱۹۵۶ء کے صفحہ ۱۰-۱۱ پر درج ہیں۔

پیداوار اشیائے خوردنی ٹنوں میں :-

۵۳-۱۹۵۲ء — ۴۴۷۰۰۰ — ۵۴-۱۹۵۳ء — ۴۴۳۰۰۰

۵۵-۱۹۵۴ء — ۲۹۵۰۰۰ — ۵۶-۱۹۵۵ء — ۴۱۰۰۰۰

(فوڈ سٹیٹکس، گورنمنٹ آف انڈیا صفحہ ۱۵ ۱۹۵۷ء)

غلہ کی درآمد منوں میں :-

۵۴-۱۹۵۳ء — ۱۰۱۲۳۵۶ (حکومت جموں و کشمیر ریویو آف پراگریس آف بخشی گورنمنٹ ۵۴-۱۹۵۳ء)

۵۵-۱۹۵۴ء — ۱۲۰۰۰۰۰ (کشمیر — این اسٹیمیٹ آف پراگریس صفحہ ۱۷)

۵۶-۱۹۵۵ء — ۱۳۵۸۰۰۰ (رپورٹ آف دی پراپوزڈ اگریکلچرل پالیسی جون ۱۹۵۶ء صفحہ ۳۵)

"[۱] ریاست کی کئی ضروریات مثلاً سنٹرل ریزرو پولیس اور دوسری ریاستوں کی جموں و کشمیر میں متعین پولیس کی ضروریات مرکزی سرکار پورا کرتی ہے۔ ریاست کا مالی انحصار بہت حد تک مرکزی سرکار کی امدادی رقوم پر ہے۔ ریاست جموں و کشمیر کو ہندوستان کی باقی ریاستوں کی نسبت فی کس قرضہ تین گنا سے بھی زیادہ ملا ہے۔

جموں و کشمیر کیلئے سب سے بڑا ذریعہ آمدن ہندوستانی سرکار کی امدادی رقوم ہیں۔ فی کس تناسب کے حساب سے اس کو سب سے زیادہ امداد یعنی ۵۲ روپے فی کس ملتی ہے۔ جبکہ باقی تمام ریاستوں کو اوسطاً ۹ روپے ملتی ہے ...... ہندوستانی سرکار کی طرف سے کشمیر کو تین مدوں یعنی عطیہ جات

---

[۱] شری رام پیارا صراف کا مضمون بحوالہ اخبار "کشمیر" سرینگر مورخہ ۲۰-۱۹ اکتوبر

مرکزی ٹیکسوں میں حصہ اور قرضہ جات کے سلسلے میں ۱۹۷۶ لاکھ روپے
۶۷۲ لاکھ روپئے اور ۱۹۷۶ لاکھ روپئے کی کل رقوم بالترتیب
منتقل کی گئی ہیں اور منتقل کی گئی کل رقم ۴۶ کروڑ روپے سے
زائد ہے۔ یہ رقم ریاست کے اندرونی ذرائع سے حاصل شدہ
آمدن سے دوگنی ہے۔ علاوہ اس کے اندرونی ذرائع سے حاصل شدہ
اس آمدنی کے ایک حصہ کا اندراج محض برائے نام آمدن کی مد میں
ہے۔ جبکہ درحقیقت اس کے مقابل ان پہ اخراجات آمدنی سے
زیادہ ہیں۔

ریاست کی کچھ مخصوص ضروریات بھی مرکز ہی پورا کرتی ہے مثال
کے طور پر سنٹرل ریزرو پولیس اور دوسری ریاستوں کی پولیس میں سے
بڑی تعداد میں پولیس فورس اس ریاست کو فراہم کرنے کے علاوہ مرکز
۲۶۵ کروڑ روپیہ کی امداد اس غرض کیلئے دیتی ہے۔ جو کہ مالی آمدن میں
نہیں دکھائی گئی ہے۔ وصول کردہ عطیہ جات اور قرضوں کے علاوہ مرکز
کی جانب سے ریاست کے دوسرے منصوبوں کے سلسلہ میں مالی امداد
بھی شامل ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں سرمایہ کی وصولی تقریباً سالم طور حکومت
ہندوستان کے قرضہ جات پر مبنی ہے۔ ریاستی بجٹ کے مطابق ۱۹۶۷
کروڑ روپے کا قرضہ ۴۰٫۶۹ کروڑ روپے کے کل سرمایہ کی وصولیات
کے مقابلے میں ۱۹۶۸-۶۹ء کیلئے حاصل کیا گیا ہے۔ یہ ۵۲ روپیہ فی
کس قرضہ بنتا ہے۔ جو کہ مرکز کی طرف سے دوسری ریاستوں کو دئے
گئے اوسطاً فی کس قرضہ کے تین گنا سے بھی زیادہ ہے۔.......
یکم اپریل ۱۹۶۷ء کو مرکز کا ۱۱۰ کروڑ روپیہ کشمیر کے ذمہ بطور قرضہ
ہے۔ موجودہ سال (۱۹۶۸ء) اس نے مزید ۲۳ کروڑ روپیہ ادھار
دیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں آج ریاست میں ۳۵۰ روپیہ فی شہری
کے حساب سے قرضہ ہے۔" ؎۱

۱۔ شری بلراج پوری کا مضمون بحوالہ ایکانامک اینڈ پولیٹیکل ویکلی بمبئی مورخہ یکم جون ۱۹۶۸ء

ریاست کو مرکزی سرکار نے تیسرے منصوبہ کے سلسلے میں جو رقوم مہیا کی تھیں اس کے لحاظ سے سارے ہندوستان کی نسبت ریاست کیلئے رقوم کی فراہمی سب سے زیادہ یعنی فی کس ۱۷۲ روپے بنتی ہے۔ چوتھے منصوبہ کا تمام خرچہ مرکزی سرکار نے برداشت کرنے کا ذمہ لے لیا ہے۔ اور اس کا تخمینہ ۲۲۵ کروڑ روپیہ ہے اس بات کا انکشاف سرینگر کی ایک اخباری کانفرنس میں ہوا تھا۔

"آج یہاں ایک اخباری کانفرنس میں مالیات کے مرکزی منسٹر آف سٹیٹ کے۔ سی۔ پنت نے کہا کہ کشمیر کے چوتھے منصوبہ کو، جو کہ ابھی مکمل کرنا باقی ہے، سالم طور تکمیل پذیر کرنے کا خرچہ حکومت ہندوستان برداشت کرے گی۔ ۔۔۔۔ کشمیر کے پلاننگ کمشنر ایس۔ کے۔ سہگل بھی مباحثہ میں شریک تھے۔ انہوں نے اخباری نمائندوں کو بتایا۔ کہ ریاست کے چوتھے منصوبے کا عارضی تخمینہ ۲۲۵ کروڑ روپیہ ہے مسٹر پنت نے کہا کہ تیسرے منصوبے میں ریاست کیلئے دی گئی رقوم ۱۷۲ روپے فی کس بنتی تھی۔ اس کے مقابلے میں کل ہند اوسط ۹۲ روپے تھی" [1]

ریاست کا مالی ڈھانچہ درہم برہم ہوا ہے۔ سرکار کے اکثر تجارتی اور کاروباری ادارے منافع بخش نہیں بن رہے ہیں۔ کئی کئی سالوں کے حسابات مرتب نہیں ہو سکے ہیں اور آڈٹ کے لحاظ سے کئی سنگین اعتراضات اور بے قاعدگیاں منصۂ شہود پر آئی ہیں لیکن سرکار نے آجتک ان اعتراضات کو دور اور درست کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے

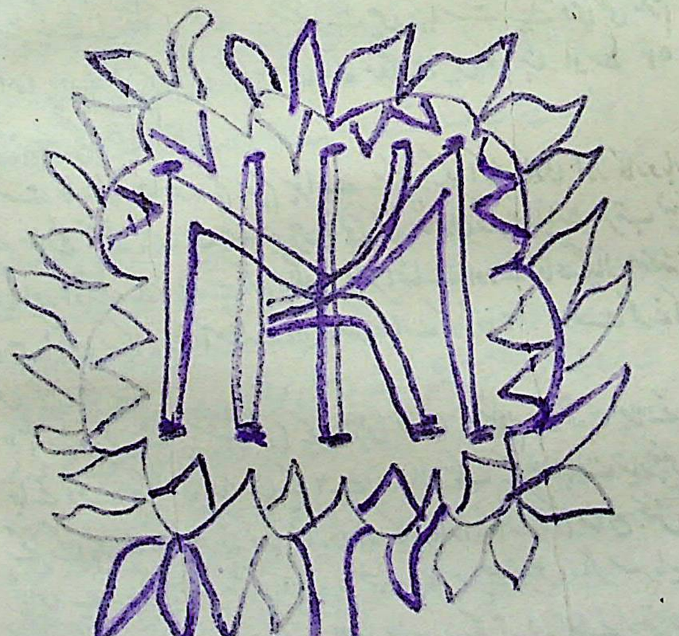
"آڈٹ رپورٹ (۱۹۶۸ء) کے مطابق محکمانہ انتظام کے تحت چلائے جانے والے سرکاری اداروں کے ۶ سے ۸ سال تک کے حسابات تیار نہیں کئے گئے ہیں اور سرکار کی کوئی تجارتی اور کاروباری کارکردگی منافع بخش نہیں ہے۔ باقی بیشتر بڑے ادارے خسارے پر چلتے ہیں۔ اگر سرمایہ کے استعمال سے اس پر واجب الادا سود سے کم آمدن آجائے۔ تو یہ واقعی غلط قاعدہ ہے۔ لیکن اس سے بھی افسوسناک امر یہ ہے کہ قرضہ

---

[1] اخبار "ہندوستان ٹائمز" نئی دہلی مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۹۶۸ء

جات سے بنایا گیا سرمایہ کسی قسم کی کمائی کیے بنا ہی غیر فائدہ رساں مدوں پر اور متواتر اخراجات میں صرف کیا جاتا ہے۔

اس کے باوجود بھی کشمیر سرکار واضح طور پر غیر ذمہ دارانہ پالیسی پر گامزن ہے۔ کمائی کم ہونے کی وجہ سے اس کی ذمہ داریاں حاصل شدہ اصلی رقوم اور ان پر واجب سود کی ادائیگی کے بارے میں نسبتاً تیزی سے بڑھتی جا رہی ہیں۔ یہ ثابت کرنے کے لیئے کسی تازہ تحقیقات کی ضرورت نہیں ہے۔ کہ ریاست کا مالی ڈھانچہ تتر بتر ہوا ہے۔ مرکزی آڈٹ نے ایک سال میں ۶۰۰۰ نقائص اور بے قاعدگیاں نوٹ کر لی ہیں اور ۳۰ نومبر ۱۹۶۷ء کو آڈٹ کے سنگین اعتراضات کی لرزہ خیز تعداد ۳۲۱۳۵ تک پہونچ گئی ہے۔ اور یہ اعتراضات کشمیر سرکار کی طرف سے درست نہیں کیئے گیے ہیں۔[۱]



[۱] شری بلراج پوری کا مضمون بحوالہ ایکانامک اینڈ پولیٹیکل ویکلی بمبئی مورخہ یکم جون ۱۹۶۸ء

فرائض سے چشم پوشی

ریاستی حکمرانوں کے طور طریقوں سے ایسا لگتا آیا ہے کہ انہیں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا اتنا احساس نہیں رہا ہے جتنا کہ انہیں ہونا چاہئے۔ ان کے فرائض اور ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہ ہونے کی وجہ شاید یہ بھی ہو سکتی ہے۔ کہ انہوں نے ہمیشہ کشمیر کے مخصوص حالات کا یا تو ناجائز فائدہ اٹھایا ہے یا اٹھانے کی کوشش کی ہے ریاست کا ایک علیحدہ آئین بھی ہے۔ جو زبان اور مفہوم کے لحاظ سے کسی بھی جمہوری آئین سے لگا کھا سکتا ہے لیکن حکمرانوں کا طرز عمل اس کے سپرٹ سے مطابقت نہیں رکھتا ہے اور نہ ہی یہ جمہوریت کے بقا کا ضامن ہو سکتا ہے۔ جب تک آئین کے حرف اور اسپرٹ پر جمہوری ڈھنگ سے عمل نہیں کیا جاتا اور اس کیلئے مناسب اور سازگار ماحول قائم نہیں کیا جاتا، عوام کے حقوق کی دستاویز تقدیس سے محروم ہو کر بے معنی بن جاتی ہے۔ اسلئے حکمرانوں کی عوام کے تئیں نیک نیتی اور قول و فعل میں ہم آہنگی ہی ان کے فرائض سے سبکدوش ہونے کی موزون کسوٹی ہے

آئین کی رُو سے ریاستی باشندوں کو تحریر و تقریر کی آزادی حاصل ہے۔ لیکن حقیقت میں یہاں کے لوگ پوری طرح اس آزادی سے فیضیاب نہیں ہوئے ہیں۔ اخبارات کی اشاعت کی اجازت دینے میں حکومت ہمیشہ جانبداری سے کام لیتی رہی ہے۔ میں شروع سے ہی حکومت کے اس طرز عمل کی جرات مندی کے ساتھ مخالفت کرتا آیا ہوں۔ اس بارے میں اپنے ایک شائع شدہ بیان کی نقل درج ذیل کرتا ہوں۔

مجھے ریاستی وزیر اعظم بخشی غلام محمد کا حالیہ بیان پڑھ کر حیرانی ہوئی جس میں انہوں نے شہری آزادی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ریاست میں اخبارات کی مکمل آزادی ہے۔ وزیر اعظم جیسے ذمہ دار آدمی سے واقعات کی روشنی میں ایسے بیان کی توقع نہیں ہو سکتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ صرف حکومت نواز اور نیم سرکاری اخبارات ہی

اضافہ کیا گیا ہے۔ اگر فی الواقعی یہاں کے عوام کو پریس کی آزادی حاصل ہے تو پھر یہاں حکومت نئے اخبارات جاری کرنے کی اجازت کیوں نہیں دیتی ہے۔ اور نہ ہی آج تک کچھ پرانے اخبارات کو شایع ہونے کی اجازت دی جاتی ہے۔ چنانچہ اخبارات شایع کرنے کی اجازت حاصل کرنے کیلئے آگے ہی درجنوں درخواستیں حکومت کے پاس پڑی ہیں۔ اسی پر اکتفا نہ کرتے ہوئے حکومت نے یہاں دفعہ ۵۰ نافذ کرکے یہاں کی سیاسی زندگی کو عملاً بالکل مفلوج کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ہے۔

اب مذکورہ دفعہ کو ہٹا کر حکومت کو جائز سیاسی سرگرمیوں کے لئے میدان کھلا چھوڑنا چاہئے۔ ورنہ اگر اس نوع کے حالات بدستور جاری رکھے گئے۔ تو پھر بہتر ہے کہ ریاست میں پریذیڈنٹ کا راج قایم کیا جائے۔ تاوقتیکہ شہری آزادی مکمل طور پہ بحال نہیں ہوجاتی۔......

میں ہندوستان [illegible] سے بھی اپیل کرتا ہوں کہ وہ ریاستی حکمرانوں کو حالات کا ناجائز فائدہ اٹھا کر شہری آزادی کو سلب کرنے کی اجازت نہ دیں اور ان کے آمرانہ طرز عمل پہ کڑی نگرانی رکھ کر اس طریقہ کار کی پیشبندی کرے"۔ ۱؎

میڈیکل، انجینیرنگ اور دیگر ٹیکنیکل کالجوں کے داخلے میں جانبداری اور امتیاز سے کام لیا جاتا ہے۔ کئی مستحق اور بے گناہ امیدواروں کو بیدردی سے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ آئین کے تحفظات کا منہ چڑھایا جاتا ہے۔ ریاستی ہائیکورٹ میں بھی ایسے کئی مقہور اور مایوس طلباء اور طالبات نے تنگ آکر داد رسی حاصل کرنے کیلئے واویلا کیا اور "رٹ پٹیشن" داخل کئے۔ صرف ذات کی بنیاد پر ٹیکنیکل اداروں میں نشستیں مخصوص کرنا اور اس کے درپردہ باقی مستحق امیدواروں سے بے انصافی برتنے کا مسئلہ بھی ہائیکورٹ کے زیر غور آیا۔ ایک رٹ پٹیشن بعنوان "للتا شوری وغیرہ بنام سٹیٹ آف جموں وکشمیر وغیرہ" میں ڈویژن بنچ کا فیصلہ مسٹر جسٹس مرتضےٰ علی (اب چیف جسٹس مرتضےٰ علی) نے صادر فرماتے ہوئے یوں رائے زنی کی ہے۔

۱؎ اخبار "ہمارا دور" سرینگر مورخہ ۲۸ اپریل ۱۹۵۸ء

"ہمارے خیال میں جب سٹیٹ آئین کے آرٹیکل ۱۵ (۴) کے مطابق سوسائٹی کے کمزور طبقوں کی بہبودی کیلئے اہتمام کرتی ہے تو اس کو اپنا کام ظاہری خوبیوں اور دانشمندی کے ساتھ انجام دینا ہے۔ بے شک اس کو کمزور عناصر کی بہبودی کیلئے مناسب بلکہ فیاضانہ اقدام کرنے ہیں، تاہم اس کو مسئلہ کی وسعت پہچانی کرنی چاہیئے۔ اور کمیونٹی کی مجموعی طور ضروریات کو دھیان میں رکھ کر ایسا فارمولہ بنانا چاہیئے۔ جو مختلف لوازمات کو دانشمندانہ طور ہم آہنگ کرے۔ اس لئے ہم مطمئن ہیں کہ زیر بحث حکم کی پاداش میں ۶۸ فیصدی امیدواروں کے لئے نشستیں مخصوص کرنا واضح طور پر آرٹیکل ۱۵ (۴) کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا ہے۔

ہم نے پہلے ہی اس بات کو نوٹ کرلیا ہے کہ زیر بحث حکم کی رو سے موجودہ معاملہ میں پسماندہ طبقوں کی گروہ بندی صرف ذات کی بنیاد پر کی گئی ہے جس کی ہمارے خیال میں آرٹیکل ۱۵ (۴) کے تحت اجازت نہیں ہے۔ ہم نے یہ بھی قرار دیا ہے کہ زیر بحث حکم کی منشاء ہے جو ۶۸ فیصدی نشستیں مخصوص کی گئی ہیں۔ وہ بھی آئین کے آرٹیکل ۱۵ (۴) کی رو سے مخصوص طریقہ وضع کرنے کیلئے دیئے گئے اختیار کے نظریہ کے مطابق نہیں ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ نکلنا ناگزیر ہے کہ آئین کے آرٹیکل ۱۵ (۴) کی رو سے سٹیٹ کو دئے گئے آئینی اختیارات پر زیر بحث حکم ایک فراڈ ہے" لے

انٹرویو کے بہانہ سے اچھے، قابل اور مستحق امیدواروں کو پچھاڑا جاتا ہے اور غیر مستحق امیدواروں کو مخصوص پالیسی کے تحت دیدہ و دانستہ طور کافی نمبرات دے کر آگے بڑھایا کر ٹیکنکل اداروں میں داخلہ دلایا جاتا ہے۔ اس طرح سے مستحق امیدواروں کی حوصلہ شکنی کرکے ان کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ "سبھاش موہن وغیرہ بنام پرنسپل میڈیکل کالج وغیرہ" رٹ پٹیشن میں ریاستی ہائیکورٹ کے فل بنچ کا فیصلہ مسٹر جسٹس مرتضےٰ علی نے صادر فرماتے ہوئے یوں گوہر افشانی کی ہے۔

"..... ظاہر ہے کہ چناؤ کمیٹی نے امیدواروں کو صرف انٹرویو میں ملے ہوئے نمبروں کی بنیاد پر ہی چُنا ہے۔ اور ان کی تعلیمی قابلیت کو زیر غور

لے اے۔ آئی۔ آر ۱۹۶۶ جموں وکشمیر صفحہ ۱۰۲

نہیں لایا ہے۔ ہمارے خیال میں تعلیمی قابلیت کو بالکل نظر انداز کر کے امیدواروں کو محض انٹرویو میں دئے گئے نمبروں کی بنا پر چن لینا صاف طور پر غیر واجب، آمرانہ اور ذاتی منشاء پر مبنی طریقہ ہے۔ جسے کہ آئین ہند کے آرٹیکل ۱۴ کی فی الفور خلاف ورزی ہوتی ہے۔ امیدواروں کا اس ڈھنگ سے چناؤ کرنے میں کمیٹی کو کسی امیدوار کے حق میں انٹرویو کے وقت نمبرات بڑھا کر پڑا بھاری کرنے کیلئے لامحدود اور بے لگام اختیار مل جاتا ہے۔ اس طرح سے قابلیت کو ناقابلیت میں اور ناقابلیت کو قابلیت میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ ہماری جیسی باتہذیب سوسائٹی میں ٹیکنیکل اداروں کیلئے امیدواروں کا چناؤ انصاف اور ظاہری خوبیوں پر مبنی ہونا چاہیے۔ جس میں مقابلہ کی بھی گنجائش ہو۔ اگر امیدوار کی قابلیت کو نظر انداز کر کے چناؤ کیا جائے جو اس نے سال ہا سال کی پڑھائی کر کے اپنے آخری امتحان میں بڑے اچھے نمبر حاصل کر کے حاصل کی ہو تو چناؤ کا ایسا ڈھنگ فطری طور ایک تہذیب یافتہ اور ترقی پذیر سوسائٹی کے اصولوں کے خلاف ہے جس کا مقصد اعلیٰ، مکمل اور سائینٹفک معیار تعلیم حاصل کرنا ہے۔"[۱]

ریاستی اسمبلی میں صنف نازک کو برسوں سے کوئی نمایندگی نہیں دیدی گئی آئین میں لیجسلیٹو اسمبلی کی بناوٹ کے بارے میں جو دفعہ ۴۷ ہے۔ اس میں درج ہے کہ "اگر صدر ریاست کے خیال میں خواتین کو اسمبلی میں مناسب نمایندگی نہیں مل گئی ہو، تو وہ دو خواتین کو مذکورہ اسمبلی کے ممبروں کے طور پر نامزد کر سکیں گے" مناسب نمایندگی کا تو سوال ہی نہیں، بلکہ ریاستی اسمبلی میں خواتین کو برسوں سے بالکل کوئی نمایندگی نہیں دیدی گئی ہے۔ یہ اور بھی تعجب انگیز ہے کہ لیجسلیٹو کونسل میں بھی عورتوں کو آج تک کوئی نمایندگی نہیں دیدی گئی ہے اس طرح سے ریاست جموں و کشمیر کی کوئی نصف آبادی کو نظر انداز کیا گیا ہے اور ان کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔ خواتین نے بھی اس پر اظہار ناراضگی کیا تھا۔ اس بارے میں شریمتی راج دلاری کول پریذیڈنٹ کشمیر سٹیٹ وومنز کانفرنس نے

---

[۱] اے۔ آئی۔ آر ۱۹۶۷ء جموں و کشمیر صفحہ ۱۱۰

اپنے ایک بیان میں خواتین کو قانون سازیہ میں نمایندگی دینے کا مطالبہ کیا تھا اور کہا تھا کہ

"یہ افسوسناک امر ہے کہ لیجسلیچر میں کوئی بھی خاتون ممبر نہیں ہے آپ نے امید ظاہر کی کہ صدر ریاست دو خواتین کو لیجسلیچر کے لئے نامزد کریں گے" ۔ [۱]

لیکن آج تک نہ ہی کسی جماعت کی طرف سے کسی خاتون کو منڈیٹ دیا گیا تھا اور نہ ہی کسی خاتون کو قانون سازیہ کا ممبر نامزد کیا گیا ہے۔ اب کی دفعہ پہلی بار کچھ خواتین کو منڈیٹ ملا ہے اور خیال ہے کہ آنے والے انتخابات میں خواتین کو ضرور کچھ نہ کچھ نمایندگی قانون سازیہ میں مل جائے گی۔

جہاں تک وزارت سازی کا تعلق رہا ہے وادی کشمیر کے اہل تشیعہ فرقہ کے ساتھ مناسب برتاؤ کبھی نہیں ہوا ہے۔ وادی میں اس فرقہ کی اتنی آبادی ہے کہ اس کو وزارت میں نمایندگی دینے سے کلیتاً نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کچھ مدت قبل پہلی بار کرگل (ڈسٹرکٹ لداخ) سے اہل تشیعہ فرقہ کو وزارت میں نمایندگی دی گئی لیکن وادی کے کسی بھی اہل تشیعہ کو آج تک وزارت میں نہیں لیا گیا ہے۔ حالانکہ کرگل کے مقابلہ میں اس فرقہ کی کہیں زیادہ تعداد وادی میں آباد ہے۔ اس فرقہ کے ساتھ حکمران جماعت کی طرف سے اور بھی زیادتی ہوئی ہے کہ وادی بھر میں کسی بھی اہل تشیعہ کو آنے والے اسمبلی انتخابات کیلئے منڈیٹ نہیں دیا گیا ہے۔

کانگریس نے آنے والے اسمبلی انتخابات کے سلسلہ میں کچھ ایسے اصحاب کو بھی منڈیٹ دیا ہے جن کے نامۂ اعمال عوام کی نظروں میں یا تو قابل تحسین نہیں یا جو عوام کی خواہش کے خلاف اقتدار کی گدیوں کے ساتھ مدت مدید سے چمٹے ہوئے ہیں ان میں شری گردھاری لال ڈوگرہ، شری تریلوچن دت، شری بیلی رام، شری نور محمد شری غیاث الدین وغیرہ شامل ہیں۔ شری ڈوگرہ کے محکمہ لاٹری میں بہت بڑا سکنڈل بھی ہوا۔ لیکن ڈوگرہ صاحب نے استعفیٰ دینے کا حوصلہ پیدا نہ کیا۔

"آج کل عوامی مطالبہ ہے کہ وزیر خزانہ شری گردھاری لال ڈوگرہ جن کے ماتحت محکمہ (لاٹری) بھی ہے کو فوری طور مستعفی ہوجانا چاہئے۔ آپ کو

---

[۱] ٹائمز آف انڈیا" دہلی مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۵۷ء

عوامی رائے عامہ کا احترام کرنا چاہیے اور شری لال بہادر شاستری اور شری سبھرامنیم کی طرح باہمت بن کر استعفیٰ دینا چاہیے۔ جس طرح انہوں نے بالترتیب ریل کے حادثہ اور لائف انشورنس کارپوریشن میں سکینڈل کی بنا پر استعفیٰ دے دیا تھا۔" لہ

صوبہ جموں اور صوبہ کشمیر کی جن لیجسلیٹو کونسل کی دو نشستوں کے لئے اساتذہ کے حلقہ سے ۱۹۵۷ء میں انتخابات ہوئے۔ اس میں حکمران جماعت نیشنل کانفرنس نے کوئی حصہ نہ لینے کا فیصلہ کیا تھا لیکن درپردہ فرقہ وارانہ رجحانات اور عناصر کو شہ دے دی گئی۔ اور آئین کی روح کو مجروح کر کے ہندو اور مسلمان کے نام پر دو ووٹوں کی تخصیص کرنے کی کوشش کی گئی۔

"..... میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہوں گا کہ نیشنل کانفرنس کے چند سرکردہ ممبروں نے ان انتخابات (اساتذہ کے انتخابات) میں فرقہ وارانہ پروپیگنڈا کی حوصلہ افزائی کی اور اس میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ جموں میں لوگوں سے کہا گیا کہ وہ مسٹر غلام رسول آزاد کو ووٹ نہ دیں، کیونکہ وہ مسلمان ہے اور کشمیر میں مسٹر نادم کے خلاف یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ چونکہ وہ ہندو ہے اس لئے اس کو ووٹ نہ دیا جائے۔ اس سلسلہ میں سرکاری ملازموں میں سے بھی کچھ اشخاص کو بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ میں آپ کی توجہ اس سی۔ آئی۔ ڈی ڈائری کی طرف دلاؤں گا، جس میں یہ رپورٹ کیا گیا تھا کہ محکمہ تعلیم کے ایک ذمہ دار افسر نے نیشنل کانفرنس کے چند سرکردہ کارکنوں کی موجودگی میں استادوں کے ایک مجمع میں تقریر کی۔ اور کہا کہ کشمیر میں ۹۷ فیصد مسلمان ہیں۔ اس لئے نادم کو ووٹ دینا کشمیر میں ۳ فیصد ہندوؤں کو اجارہ داری دینے کے مترادف ہے۔ اس رپورٹ کی تصدیق ہمارے اننت ناگ کے کچھ کارکنوں نے بھی کی۔" ۲ہ

اسمبلی انتخابات میں بھی حکمران جماعت نے کہیں کہیں کفر و اسلام کے واسطے

لہ اخبار "اکنامک پوسٹ" سرینگر مورخہ ۱۷ر اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء

۲ہ صادق صاحب کا خط مورخہ ۶ر جولائی سنہ ۱۹۵۷ء بخشی صاحب کے نام۔

دئے۔ چنانچہ صادق صاحب نے ۱۹؍ جولائی ۱۹۵۷ء کو اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا:-

"پچھلے انتخابات میں بعض جگہوں سے کچھ نعرے بلند کئے گئے اگر یہ نعرے فرقہ پرستوں کی طرف سے بلند کئے جاتے تو افسوس نہ ہوتا مگر یہ نعرے ان لوگوں کی طرف سے بلند کئے گئے جو سیکولرازم کے دعوے دار ہیں ..... آئین میں درج ہے کہ ہر شخص چاہے وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ اس کے ساتھ امتیازی سلوک نہ ہوگا .... انتخابات میں انگلیاں اٹھائی گئیں۔ دینداری کے واسطے دئے گئے کفر و اسلام کی آویزش کا ذکر کیا گیا۔"

کچھ لوگ اخلاق اور چلن کے اعتبار سے ناقابل ستائش ہونے کے باوجود حکمران جماعت کے چوہدری بن بیٹھے تھے اور اس کو اپنی پناہ گاہ بنا لیا تھا۔ اہل اقتدار کبھی کبھی صوبائی تعصب کو ہوا دے کر کسی وقت صوبہ جموں کو کشمیر کے خلاف اور کسی وقت صوبہ کشمیر کو جموں کے خلاف اپنے نجی مفادات کے خاطر استعمال کرنے سے بھی نہیں جھجکتے۔ اس صورت حال میں مقامی ذرائع کا صحیح اور جائز استعمال نہیں ہوتا ہے۔ نہ ہی کوئی فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش کی جاتی ہے۔

"روپیہ ان کاموں اور سکیموں پر خرچ کیا جا رہا ہے۔ جن میں قومی آمدن میں اضافہ ہونے کی بجائے کئے ہوئے کاموں کی حالت کو برقرار رکھنے کیلئے مزید سرمایہ کی ضرورت ہے۔ نمائش گاہیں بنائی جا رہی ہیں۔ بڑے بڑے فیسٹول منائے جاتے ہیں۔ بغیر کسی سروے کے کشتواڑ کی نہر شروع کردی گئی ہے۔ تیس لاکھ روپیہ کے قریب خرچ ہونے کے باوجود نتیجہ کوئی برآمد نہیں ہو رہا۔ اسی طرح بارہ کروڑ روپیہ خرچ کرکے کنڈی کیلئے راوی سے نکالی جانے والی نہر کا حشر ہو رہا ہے۔ اسی لاکھ روپے کے قریب خرچ کرکے بجلی کی لائین جوگندر نگر سے جموں تک لائی گئی ہے۔ اور اس کو ڈبل کرنے کے لئے اتنی ہی رقم خرچ کرنے کی ایک اور سکیم بنائی جا رہی ہے اگر یہ سکیم بھی مکمل ہو جائے تو بھی جوگندر نگر سے آنے والی بجلی

اس قدر مہنگی پڑے گی کہ وہ صنعتی کاموں کیلئے سود مند ثابت نہ ہو سکے گی لیکن بجلی کی ان لائنوں کی حالت کو برقرار رکھنے کیلئے ہر سال کتنا ہی روپیہ خرچ کرنا ہوگا۔ مگر تعصب کو چھوڑ کر اگر فراخدلی اور عقل سے شروع میں ہی کام لیا جاتا۔ تو اسی دو اڑھائی کروڑ روپے کے خرچ سے ریاسی تحصیل میں دھیان گڑھ پراجکٹ بنا کر سارے صوبہ جموں کو بجلی مہیا کی جا سکتی تھی۔ بلکہ اسی علاقہ میں کان کنی اور دوسری صنعتوں کو قائم کرنے کی راہیں کھل جاتیں جس سے ساری ریاست کی کایا کلپ ہو سکتی تھی۔" [1]

ریاست میں جب جب حکومت بدل گئی اور نئی حکومت ظہور میں آئی تو لوگوں کو امید بندھ جاتی تھی کہ نئی سرکار صاف ستھری ایڈمنسٹریشن دے کر صحت مند اور ترقی پرورانہ اقدام کرے گی لیکن جب نئی حکومت غیر متوقع طور کئی باتوں میں پرانی حکومت کی ہی تقلید کرتی تو عوام کی دل آزاری ہو جاتی اور وہ ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتے۔ اس کا تذکرہ میں نے اپنے ایک پمفلٹ میں بھی کیا تھا۔

"ریاست جموں و کشمیر کے حالات روز بروز تشویشناک ہوتے جا رہے ہیں۔ کبھی امید کی ایک موہوم سی کرن نظر آتی ہے اور کبھی ایک ہولناک اندھیارے سے دور دور تک پھیلی ہوئی گھناونی تاریکی ریاستی عوام کی زندگیوں کو مغلوب کرتی نظر آ رہی ہے ریاستی عوام اسی امید و بیم کے درمیان لٹکے ہوئے ہیں۔ لوگوں کے پژمردہ دلوں میں ایک تمنا جاگ اٹھی تھی کہ حکومت میں ایک تغیر و تبدل ہو اور بلند بانگ دعاوی کرنے والے بھی آزمائے جائیں تاکہ یہ پھیلتی ہوئی تاریکی سمٹ کر فارغ البالی کی شعاع سے معدوم ہو جائے! اس روشنی کی تمنا کرنے والا خصوصی طور پر عوام کا ایک باشعور سیاسی طبقہ تھا اور شاید اسی لئے اس خیال کو قوت تحریک ملی کہ پھیلتی ہوئی تاریکی کو رد کیا جائے۔ اور اس پھیکی سی کرن کو تیز شعاع میں بدل دیا جائے۔ حکومت بدل گئی اور موجودہ حکمران اقتدار کلی حاصل کرنے کی ایک دیرینہ آرزو سے ہمکنار ہو گئے لیکن پھیلتی ہوئی تاریکی

[1] اخبار "جے سودیش" جموں مورخہ ۲۷ فروری ۱۹۵۸ء

سمٹ نہ سکی اور موہوم سی کرن تیز شعاع بن نہ سکی۔ بلکہ خوشحالی کی آرزو اور روشنی کی نشاندہی کرنے والی محرک قوتیں، اقتدار سنبھالنے والوں کی فرائض کے تئیں پہلو تہی اور بے راہ روی پر سرگرداں ہونے لگیں" ۱؎

کشمیر سرکار نے غیر فرقہ وارانہ، ترقی پسند اور جمہوری اپوزیشن کو خاص طور سے کبھی برداشت نہیں کیا۔ ان کے کام کرنے میں ہمیشہ اڑچنیں ڈالی گئیں اور ان کے صحت مند جمہوری کردار کو ختم کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ اور انہیں جلسہ تک کرنے کی اجازت نہیں ملتی۔ حکومت کے اس رویہ کے خلاف میں نے ایک پریس کانفرنس میں بھی احتجاج کیا۔ میں نے سرکار پر الزام لگایا کہ

"وہ کشمیر میں جمہوری اور سیکولر طاقتوں کو موثر طور پر پنپتا ہوا دیکھنا نہیں چاہتی ہے۔ .... متعلقہ سرکاری حکام نے پرجا سوشلسٹ پارٹی کو حبہ کدل سرینگر میں بڑھتی ہوئی مہنگائی کے خلاف پبلک جلسہ منعقد کرنے کی اجازت نہیں دے دی۔ جب کہ کانگریس اور جن سنگھ کو حبہ کدل اور دوسری جگہوں پر جلسے منعقد کرنے دئے گئے۔ آپ نے مزید کہا کہ ہم نے ڈسٹرکٹ میجسٹریٹ سرینگر کو جن سنگھ کی طرف سے حبہ کدل میں منعقد کئے گئے جلسہ کے دوسرے دن ہی یعنی ۱۶ ار اگست کو حبہ کدل میں ہمیں ۲۳ ر اگست کیلئے جلسہ منعقد کرنے کے بارے میں ایک درخواست دے دی۔ لیکن ہمیں اجازت دینے میں ٹال مٹول کیا جاتا رہا اور بالآخر صاف انکار کیا گیا۔ شری پیارے لال کول نے حکومت کو متنبہ کیا کہ اگر وہ پرجا سوشلسٹ پارٹی کے تئیں ایسا رویہ جاری رکھے گی تو دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کی جائیگی" ۲؎

حکمرانوں کی طرف سے جیزمن مانی کاروائیاں اور بدعنوانیاں جاری تو تھیں ہی، لیکن عوام کے اہم مسائل اور جائز شکایات اور مشکلات کی طرف توجہ دینے سے بھی کنی کتراتے آئے ہیں۔ اور اپنے فرائض سے برابر کوتاہی کرتے آئے ہیں۔ اپنے اقتدار کو مضبوط و مستحکم بنانے کیلئے کچھ علیحدہ سرکاری تنظیمیں قائم کر رکھیں، جنہیں اپنے

۱؎ "یہ سرکار نہیں چلے گی" پیارے لال کول ار ستمبر ۱۹۶۶ء

۲؎ اخبار "سویرا" دہلی مورخہ ۳ ر ستمبر ۱۹۶۶ء

سیاسی اغراض کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس بارے میں میں نے اپنے ایک اور پمفلٹ میں لکھا تھا:۔

"موجودہ حکمرانوں کو غالباً احساس ہوا ہے کہ انہیں کسی کا اعتماد حاصل نہیں رہا ہے۔ اور ان کے پاؤں کہیں جمتے نہیں ہیں۔ اور یہ کہ ان کی نااہلیت کی وجہ سے یہاں کانگریس کے قیام کا دراصل انجام خود کانگریس کے وجود کا خاتمہ ثابت ہوا ہے۔ اسی لئے اب انہوں نے ریاستی سیاسیات میں REGIMENTATION شروع کردی ہے۔ اور اس غرض کے لئے مختلف بہانوں سے اور مختلف ناموں کے تحت اپنے ذاتی مفادات اور اپنے ذاتی سیاسی بچاؤ کیلئے ہوم گارڈ اور فیلڈ سروے آرگنائزیشن جیسی سرکاری جماعتوں کا قیام عمل میں لاکر خزانہ عامرہ کا ناجائز استعمال کر رہے ہیں۔ اور ان جماعتوں میں ایسے سینکڑوں لوگوں کو بھرتی کیا گیا ہے۔ جن کے اعمال اور جن کا سابقہ سیاسی کردار ناقابل تعریف ہے...... اس لئے عیاں ہے کہ موجودہ حکومتی رہنما یہاں کی پبلک زندگی کو کیسے اور کس حد تک اپنے ذاتی اقتدار کیلئے پراگندہ کرنا چاہتے ہیں اور کرتے ہیں...... حالیہ جنگ کی وجہ سے جموں میں لاکھ بھر سے زائد جو لوگ...... بے گھر ہو گئے۔ ان سے ہمارے کرسیِ اقتدار کے نازک مزاج مجنوں نباہ نہیں کر سکے۔ اور ان کی جائز شکایات کو روندتے رہے...... اسی طرح سے بٹہ مالو سرینگر اور کچھ دیگر علاقوں کے ہزاروں لوگ آن واحد میں بے گھر ہو گئے۔ اور ان کی حالتِ زار کا جائزہ لینے کیلئے پرجا سوشلسٹ پارٹی کے کچھ پارلیمنٹ ممبروں کا ایک وفد فوراً ہی دہلی سے یہاں پہونچ گیا تھا اور راقم الحروف کے ہمراہ بٹہ مالو اور کچھ کیمپوں کا بہ نفس نفیس معائنہ کیا......

لیکن اب تک ان بے گھر لوگوں کو کشمیر سرکار کی طرف سے صحیح ڈھنگ سے بسانے کے لئے کوئی مناسب اقدامات نہیں کئے گئے ہیں۔"[1]

وزارت میں لئے جانے کا کوئی معیار نہیں ہے۔ وزیر کا کردار، اس کی قابلیت

---

[1] "یہ سسکتی سرکار" پیارے لال کول ۱۹۶۶ء

اس کا حسن سلوک، اس کے آداب و اعمال، لوگوں کے ساتھ اس کے تعلقات ایسی چیزیں ہیں، جن کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔ بلکہ خالص سیاسی مصلحتیں ہی وزیر وں کے چننے میں کارفرما ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایسے ہی ایک وزیر کے متعلق یوں دلچسپ گوہر افشانی ہوتی ہے

"...... کے متعلق ایک کانفرنس میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ جب سے ...... وزارت کی کرسی پر آئے ہیں۔ تب سے ہر خوبصورت چیز پر اپنا حق فائق تصور کرتے ہیں۔ کوئی بھی خوبصورت عورت، اچھی زمین، اعلیٰ نسل کی بھیڑ بکریاں، بڑھیا اونی کمبل اور لوئیاں نئے نئے کرنسی نوٹ، اور دوسری عمدہ چیزیں اپنے علاقہ اور برادری کے لوگوں سے جائز ناجائز طریق پر حاصل کرنے میں ہمیشہ قدم رہتے ہیں" [۱]

ریاستی سرکار عام بیانات دینے میں اور خوش کن پالیسی بیانات مرتب اور مشتہر کرنے میں بڑی دلچسپی لیتی ہے۔ لیکن ان پر عمل پیرا ہونے میں اتنی ہی دلچسپی نہیں لیتی ہے۔ حکومت کے قول و فعل میں تضاد کے پیش نظر عوام کا حکومت کے تئیں متنفر ہونا قدرتی امر ہے۔ صادق صاحب نے اپنے ایک پالیسی بیان میں منجملہ دیگر باتوں کے علاوہ زراعت کے بارے میں کہا تھا:

"زراعت کا کام کرنے والے مختلف گروہوں مثلاً مالک و کاشت کار کے درمیان تمام تعلقات کا جائزہ لیا جائے گا۔ اور زمین سے متعلق قوانین پر نظر ثانی کی جائے گی، تاکہ زیادہ سے زیادہ کام اور منصفانہ تعلقات کی ضمانت ملے۔

زراعت کے متعلق میں اس وعدہ کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں۔ جو میری جماعت کی طرف سے ریاست میں کیا گیا ہے کہ جلدی ہی زمیندار کی پرانی مشکلات اور حسابی طور متوازن لیکن ناانصافی پر مبنی مالیہ کو ختم کیا جائیگا۔ اس کے مقابلے میں امکانی حد تک اصلی کمائی پر زیادہ صحیح اور موزوں ٹیکس عائد کیا جائے گا۔

---

[۱] اخبار "چاند" جموں مورخہ ۷ر اکتوبر سنہ ۱۹۶۸ء

اور چھوٹے زمینداروں کو مکمل چھوٹ دے دی جائے گی۔ ہم جلد ہی اس کی تفاصیل تیار کرکے اس کیلئے قانون بنائیں گے" ۱

اس پالیسی بیان کے بعد کوئی کاروائی نہ ہوئی۔ نہ ہی مالیہ کے سلسلہ میں کوئی اصلاح ہوئی۔ اور نہ ہی آج تک کسی قانون کو تشکیل دیا گیا۔ بلکہ ایک بات ضرور ہوگئی کہ مالکان اراضی اور کاشتکاروں کے تعلقات بہت کشیدہ ہوئے۔ ایک بار حکومت نے چکداروں کو زمین خود کاشت کرنے کیلئے کاشتکاروں کے خلاف بیدخلی کی کاروائیاں عدالت مال میں دائر کرنے کی اجازت دیدی۔ ہزاروں بے دخلی کی درخواستیں اندر میعاد دائر ہوگئیں۔ اور جلدی میں چکداروں کے لاکھوں روپے اس کاروائی پر خرچ ہوگئے۔ اس میں سے ایک خاصی رقم سرکاری خزانہ کو بھی بسلسلہ اسٹامپ وغیرہ چلی گئی۔ بیدخلی کی درخواست دینے کی معیاد گذرنے کے بعد جب ان مقدموں کی سماعت کا وقت آیا تو حکومت نے ایسی تمام کاروائیوں کو معرض التوا میں رکھنے کا حکم صادر کیا۔ یہاں کے لوگ حکمرانوں کی بے سروپیر کی کاروائیوں پر تمسخر اڑاتے ہیں۔ اگر حکومت کو نیک نیتی سے کاشتکاروں کی بیدخلیاں مقصود نہیں تھیں۔ تو چکداروں کا روپیہ، محنت اور وقت ضایع کرکے ان سے یہ مذاق کرنے کی حکومت کو کیا سوجھی تھی۔ اگر حکومت نے اپنے اقدام کو جائز سمجھا تھا تو پھر اسے روک کیوں دیا گیا۔ میں کاشتکاروں کے حق میں ہوں لیکن حکمران اپنے فرائض کو نہ سمجھتے ہوئے غیر ذمہ داری کے ساتھ عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اور افراتفری پیدا کرنے کے موجب بنتے ہیں۔ چکداروں اور کاشت کاروں کے درمیان تناؤ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حکومت کے سامنے زمین ایک اقتصادی مسئلہ نہیں بلکہ وہ اسے سیاسی مسئلہ بنا بیٹھی ہے۔ زمیندار ایسوسی ایشن نے بھی اس پر واویلا کیا۔

"حکومت نے چند کنال زمین مالکان کو خود کاشت کرنے کیلئے قانون بنایا تھا۔ ان کے حصول کیلئے درخواستیں محکمۂ مال میں پیش ہوئیں جن پر روپیہ خرچ آیا ہے۔ بعد میں حکومت نے درخواستوں کو بلاوجہ معرض التوا میں رکھا۔ جن سے مالکان اراضی کے تعلقات کاشتکاروں کیساتھ اور بھی خراب ہوئے۔ مالک زمین نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔ ..."

---

۱ پالیسی سٹیٹمنٹ مسٹر جی۔ ایم۔ صادق چیف منسٹر جموں و کشمیر، ۷ مارچ ۱۹۶۷ء

اراضیات کے متعلق جو بھی قانون مرکز پاس کرے گا۔ وہی قانون ہماری ریاست میں نافذ العمل ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ہماری ریاست کے عدل وانصاف کا سپریم کورٹ ایک ہی ہے" ۔ ۱ے

سرکاری زمینوں پر ناجائز قبضہ کئے جانے کا مسئلہ اہم بن چکا ہے۔ اس بارے میں غنڈہ گردی اور بدنظمی کی کئی مثالیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

"ہماری ریاست میں سرکاری زمین پر ناجائز قبضہ کرنا ایک عام صورت بن گئی ہے۔ اگر یہ صورت حال جاری رہی۔ تو وہ دن دور نہیں ہوگا۔ جب ریاست میں ابتدائے آفرینش کے ماحول کی تصویر پیش ہوگی۔ اور یہ ہماری زندگی کے دوسرے شعبوں پر بھی حاوی ہوگا۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس والی حالت ہے۔ جو ریاست میں کمزور امن وانتظام کی دلالت کرتی ہے۔ ہمارے پاس یہ اطمینان کرنے کیلئے کافی ثبوت موجود ہیں۔ کہ ایسی بدنما فضا خود سرکاری اہلکاروں نے پیدا کر رکھی ہے۔ .... جب کوئی اس صورت کو چیلنج کرتا ہے تو حکومت کی انتظامیہ مشینری بیدخلی کے احکام سرانجام دینے سے انکار کرتی ہے اور ایسے قانون شکن عناصر کو کافی مواقع فراہم کرتی ہے۔ تاکہ وہ عدالت سے رجوع کرکے احکام التوا حاصل کریں۔ ہماری عدالتوں کی حالت بھی حوصلہ افزا اور قابل تعریف نہیں ہے۔ جہاں ایسے مقدمات جمع ہوکر سالوں تک لٹکتے رہتے ہیں۔ ہماری اطلاع کے مطابق اس قسم کے کم و بیش تین ہزار مقدمات ریاست کی مختلف عدالتوں میں اٹکے ہوئے ہیں" ۔ ۲ے

محکمہ تعلیم کا نظام بوسیدہ ہوکر بالکل بگڑ گیا ہے۔ اس محکمہ میں صحت مند اور ترقی پرور رجحانات کو تلانجلی دے دی گئی ہے۔ اور ٹیچروں میں ایک ہیجان مسلسل طور پیدا کیا گیا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ محکمہ مدت سے صادق صاحب کے ماتحت چلا آرہا تھا۔ اور وہ رحمت حق ہونے تک وزیر تعلیم رہے

۱ے جموں وکشمیر زمیندار ایسوسی ایشن کا میمورنڈم، صدر جمہوریہ کی خدمت میں ۲۵ ؍ اپریل ۱۹۷۱ء

۲ے اخبار "اکنامک پوسٹ" سرینگر مورخہ ۳ ؍ اگست ۱۹۷۱ء

لیکن پھر بھی اس محکمہ میں صوبائی تعصب اور فرقہ وارانہ کدورت کو ابھارا گیا اور دانستہ طور پر ابھارا جاتا رہا۔

جموں وکشمیر گورنمنٹ گزٹ مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۹۶۵ء میں سرکار کا ایک نوٹیفکیشن شائع ہوا ہے۔ جس میں کشمیر ایجوکیشنل سروس کے بھرتی قاعدوں کے متعلق گورنمنٹ آرڈر ۱۳۳۹-ای مورخہ ۷ ستمبر ۱۹۶۵ء کا حوالہ دیکر کلاس VI سے ترقی چن کر دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اور ایجوکیشنل سبارڈونیٹ سروس کے سلسلہ میں پچاس فیصدی ترقیاں سینیارٹی اور قابلیت کی بنیاد پر اور پچاس فیصدی ترقیاں چن کر دئے جانے کا اعلان ہوا ہے۔ پانچ سال کی پڑھائی کا تجربہ رکھنے والے بی۔ایڈ امیدواروں کو ترقی کیلئے زیر غور لایا جا سکتا ہے۔ اس حکم کی رو سے حکومت کو ٹیچروں کی بھرتی اور ترقی کے بارے میں مطلق العنانہ اختیارات مل گئے ہیں۔ اور بیک جنبش قلم سرے سے ہی پچاس فیصدی مستحق امیدواروں کو ترقی سے محروم کرنیکا حربہ بنا کر منظور نظر ٹیچروں کو آمرانہ طریقہ سے ترقی سے نوازنے اور باقی بے بس اور بے گناہ ٹیچروں کے اوپر ٹھونسنے کا ذریعہ حکومت نے نکالا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے ٹیچروں کو ترقیاں دینے کے بارے میں حکومت کی جانب سے انٹرویو لیا گیا۔ ہندو ٹیچروں نے اس انٹرویو کا اس بناء پر بائیکاٹ کیا۔ کہ حکومت کا یہ اقدام نیک نیتی پر مبنی نہیں تھا۔

انتخابات کے دوران مرکزی اور ریاستی وزرا جب خالص انتخابی مہم میں لگ جاتے ہیں۔ اور کوئی سرکاری کام کئے بغیر صرف انتخابی دوروں پر جاتے ہیں اور تقریریں جھاڑتے ہیں تو اس کیلئے بھی وہ سفر الاونس وغیرہ حاصل کرتے ہیں۔ ۱۹۷۱ء کے ضمنی پارلیمانی انتخابات میں دو مرکزی وزراء ڈاکٹر کرن سنگھ اور شری محمد شفیع قریشی ریاست جموں وکشمیر میں انتخاب لڑ رہے تھے۔ انہوں نے اس دوران اپنا بیشتر وقت اپنے اپنے حلقہ انتخاب میں گذارا۔ لیکن تنخواہ ، الاونس وغیرہ جاری رہے۔ جیسے کسی سرکاری کام پر گئے ہوں۔ روزانہ انگریزی "پوسٹ" سرینگر نے اپنے ایک اداریہ بعنوان "اب یہ بتایا جا سکتا ہے" میں اس بارے میں لکھا ہے۔

"پارلیمنٹ کے حالیہ ضمنی انتخابات کے سلسلے میں ریاست جموں وکشمیر میں منسٹروں نے کانگریسی امیدواروں کے حق میں انتخابی مہم

کے دوران تقریباً پچاس ہزار روپے خزانہ عامرہ سے بطور الاونس حاصل کئے ہیں ..... ان منسٹروں نے ان ایام کیلئے بھی الاونس حاصل کیا۔ جبکہ انہوں نے کوئی سرکاری کام نہ کیا۔ بلکہ صرف کانگرسی امیدواروں کی حمایت میں عوامی جلسوں سے خطاب کیا۔ مرکز کے نائب وزیر ریلوے مسٹر شفیع قریشی کشمیر میں لگاتار ایک ماہ سے زائد رہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ سب سے زیادہ رقم الاونس کے طور پر مسٹر رندھیر سنگھ سٹیٹ منسٹر نے حاصل کی۔ جنہوں نے زیادہ وقت مرکزی وزیر سیاحت ڈاکٹر کرن سنگھ کے ساتھ ان کے حلقہ اودھمپور کے دورہ میں گذارا ہے۔ [1]

وزراء صاحبان اقتدار کے ناطے سرکاری سہولیات کا انتخابات کے دوران ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور غیر ذمہ داری کے ساتھ جہاں عوام الناس کا خون نچوڑ کر ٹیکس کا پیسہ انتخابی دوروں پر بے دریغ خرچ کیا جاتا ہے۔ وہاں سرکاری شان پر تکیہ کر کے رائے دہندگان پر غیر واجب طور پر دباؤ ڈالتے ہیں۔ اس ضمن میں ۱۹۶۷ء کے اسمبلی انتخابات کے سلسلے میں ایک ایسے ہی منسٹر صاحب کے زریں خیالات کا حوالہ دے کر جموں کے ایک اخبار نے لکھا ہے۔

"ہیرانگر میں شری گردھاری لال ڈوگرہ کے انتخابی جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے کشمیر کے حالیہ انتخابات میں بلا مقابلہ کامیاب قرار دئے گئے ممبر لوک سبھا اور بھارت سرکار کے موجودہ ڈپٹی منسٹر شری محمد شفیع قریشی نے جو تقریر کی۔ وہ لایقینی ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ بودی سی بھی تھی۔ اور جس کا جلسہ کے اختتام پر بھی چرچا رہا۔ چنانچہ آپ کی تقریر کے دو جملے ناظرین کی دلچسپی کے لئے بھی درج کئے جاتے ہیں۔ تاکہ ناظرین خود اس تقریر کے بودے پن کا اندازہ لگا سکیں۔

آپ نے فرمایا۔ (۱) کانگریس نے ۲۲ سیٹیں بلا مقابلہ جیت لی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اب حکومت تو کانگریس ہی بنائیگی۔ جو آپ کو سب کچھ دے سکتی ہے۔ جن سنگھ جیسی جماعتیں آپ کا کیا بھلا کر

[1] اخبار "اکنامک پوسٹ" سرینگر مورخہ اول جون سنہ ۱۹۷۱ء

سکتی ہیں۔

دانی میں بھارت سرکار کا ایک منسٹر ہوں۔ میں ۲-۱/۲ ۳ ہزار میل دور کیرلا میں گیا ہوا تھا۔ مجھے وہاں یہ حکم ملا۔ کہ میں فوراً شری گوہاری لال جی ڈوگرہ کی کانسٹی چیونسی ہیرانگر میں پہنچوں۔ چنانچہ میں آگیا۔ یہ کانگریس کی تنظیم میں ہی ممکن ہے۔ کہ پنڈت پریم ناتھ جی ڈوگرہ ایک چپراسی کو بھی یوں بُلا سکتے ہیں۔" سلہ

اگرچہ کشمیر کو قدرت کی طرف سے خوبصورتی عطا ہوئی ہے اور شہر سرینگر دریائے جہلم کے دو کناروں پر آباد ہے۔ لیکن اس کو خوبصورت بنائے جانے کی طرف سرکار نے کبھی کوئی توجہ سنجیدگی کے ساتھ نہیں کی۔ میونسپلٹی کا نظام بگڑا ہوا ہے اور گلی کوچوں کی تعمیر و مرمت کرنے کی زحمت نہیں اٹھاتی ہے۔ اگرچہ بارہا حکومت سرینگر کو خوبصورت بنانے کیلئے سوچتی رہی لیکن عملی طور پر کبھی پہل نہیں کی گئی۔ چونکہ سرینگر سیاحت کے لحاظ سے ایک اہم شہر ہے۔ اس لئے بھی لازم ہے۔ کہ اس کو خوبصورت بنایا جائے۔ خوبصورت بنانا تو دور، سرینگر صفائی کے لحاظ سے بھی کسی معیار کا شہر نہیں۔ سرکار کے اپنے فرائض سے سبکدوش نہ ہونا اور عدم توجہی برتنے کی یہ ایک جیتی جاگتی مثال ہے۔

"ہندوستان کے سارے شہروں کو خوبصورت بنایا جارہا ہے۔ لیکن سرینگر شہر کی طرف توجہ دینے کی کوئی زحمت ہی گوارا نہیں کرتا ہے یہاں تک کہ وزیر اعظم ہند شریمتی اندرا گاندھی نے وادی کے اپنے جون ۱۹۷۱ء والے پچھلے دورہ میں صاف گوئی سے کام لے کر تسلیم کیا۔ کہ شہر سرینگر بہت بڑے گندہ میں تبدیل ہو رہا ہے" سلہ

پانی اور بجلی کی بہم رسانی کا انتظام بھی ناقابلِ بخش ہے۔ بجلی کی رو بیشتر اوقات پر بند رہتی ہے۔ لیکن فیس کی وصولی میں یہ محکمے بڑے مستعد ہیں اور اپنی خامیوں کے باوجود صارفین سے بڑی سختی برتتے ہیں۔ محکمہ صحت عامہ کا حال بھی قابلِ تحسین نہیں ہے

سلہ - اخبار "آزاد" جموں مورخہ ۲۷ر فروری ۱۹۶۷ء

سلہ اخبار "اکنامک پوسٹ" سرینگر مورخہ ۷ر اگست ۱۹۷۱ء

"حکومت کا یہ پروپیگنڈا کہ صحت عامہ پر فی کس خرچہ ۱۴ پیسے سے بڑھ کر اب دس روپے پچھتر پیسے تک پہونچ گیا ہے۔ لوگوں کو اس وقت تک مطمئن نہیں کر سکتا ہے۔ جب تک کہ اس محکمہ کی بنیادی کارکردگی میں درستی نہیں کی جاتی ہے۔" [1]

---

[1] ۔ اخبار "اکنامک پوسٹ" سرینگر مورخہ یکم ستمبر سنہ ۱۹۷۱ء

زاویے اور اندیشے

محاذ رائے شماری ریاست جموں و کشمیر کی ایک بڑی جماعت ہے۔ اگرچہ اس کو ایک عرصہ پہلے قانونی طور ممنوع جماعت قرار دے کر ظاہرا طور ختم کیا گیا ہے لیکن اس جماعت کے ساتھ دلچسپی رکھنے والے اب بھی ذہنی طور اس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اس جماعت کا کردار عجیب رہا ہے۔ کچھ معنویانہ رہا ہے کچھ معترضانہ رہا ہے اور کچھ خیالی اور کچھ تمثیلی۔ اس سے یہاں کے لوگوں کو فائدہ تدارد، پریشانیاں بسیار ہیجان قلبی عمیق و عذاب ذہنی شدید۔ محاذ رائے شماری کا نصب العین ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ رائے شماری سے ہو۔ عوام کے روزمرہ مسائل کے ساتھ اس جماعت کو عام طور پر کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے اور نہ عوام کو درپیش مشکلات کی خاطر اس جماعت نے کبھی کوئی معنی خیز حرکت کی ہے۔ اس کی اساس منفی سیاست پر رہی ہے۔ محاذ رائے شماری والوں نے شاید سمجھ رکھا ہے کہ جب تک ان کو رائے شماری کرنے کا حق نہیں ملتا جب تک چاند اور سورج کا طلوع ہونا موقوف ہے۔ جب تک انہیں صاف اور سستے داموں راشن ملنے کی ضرورت نہیں ہے جب تک انہیں محلہ گلی کوچے اور سڑکیں درکار نہیں ہیں۔ جب تک انہیں مناسب مقدار میں پانی اور روشنی ملنے کی خواہش نہیں ہے۔ جب تک وہ علاج معالجہ سے معذور ہیں۔ خواتین بچہ گی اور زچہ گی سے مبرا ہیں اور ہسپتالوں میں روا بے ضابطگیوں کے خلاف کوئی اف تک نہ کرے۔ جب تک وہ موجودہ وقت کے تقاضوں کے مطابق اچھی زندگی بسر کرنے کیلئے ضروری سہولیات اور فوائد کے مستحق نہیں ہیں۔ آخر حق رائے شماری کے حصول کا جو انتظار ہے۔ نتیجہ یہ کہ محاذ رائے شماری نے رائے شماری کا نعرہ دینے کے بغیر عملی طور شہری شکوہ و شکایات اور روزمرہ مسائل سے صرف نظر ہی برت کر کوئی دلچسپی نہ دکھائی محاذ رائے شماری کی اس بے راہ روی کی وجہ سے حکمران جماعت کو ہمیشہ کھلی ڈھیل ملتی رہی۔ اور وہ لوگوں کی خاصی تعداد میں انتخابات کے تئیں عدم توجہی اور وزارت سازی میں عدم دلچسپی کا فائدہ اٹھا کر عنان حکومت کو مزے لے کر تھامے رہی اور کئی لوگ اس بناء پر ناجائز فوائد اور سہولیات سرکاری خزانے سے حاصل کرتے رہے جبکہ

عوام الناس کی اصلی اور صحیح نمائندوں سے محروم ہوتے رہے۔ اس طرح سے ریاست جموں وکشمیر میں اقتدار کو ایک مخصوص گروہ کے ہاتھوں میں ہمیشہ سونپنے کے بہت حد تک محاذ رائے شماری اور مسٹر شیخ عبداللہ ذمہ دار رہے ہیں۔ اس کی پاداش میں عوام سے بے مروتی ہونے کی ذمہ داری بھی انہیں قبول کرلینی چاہیے۔ ورنہ حکمرانوں کو موثر ڈھنگ سے للکارنے کی صورت نکلتی۔ دوران کے حالات کا ناجائز فائدہ اٹھاکر مخالفوں کو دبانے میں بھی روک لگ جاتی۔ اور نہ اپنی من مانیاں کرنے میں خود کو بالکل آزاد اور مطلق العنان نہیں پاتے۔ اور انتخابات کا محض بہانہ بناکر مخالفوں کو لالچ یا دھمکیاں دیکر دبانے کی کوشش کرکے اپنے منظور نظروں کو غیر جمہوری ہتھکنڈوں سے کامیاب نہ کرا سکتے۔ اور نہ مخالف امیدوار کو سنگھی کہہ کر دبایا جاتا اور نہ مخالف مسلمان کو پاکستانی کہہ کر خاموش کیا جاتا۔ نمونہ کے طور پر ایک چھوٹی سی مثال پیش کرتا ہوں۔

درہال تحصیل راجوری (جموں) کے میرے ایک دوست شری ملک عبدالرحمان اختر نے ۱۹۶۲ء میں ریاستی اسمبلی کا انتخاب اپنے حلقہ انتخاب درہال سے بحیثیت پرجا سوشلسٹ امیدوار حکمران جماعت کے امیدوار مسٹر محمد اقبال کے خلاف لڑا۔ اس حلقہ انتخاب میں غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ شری اختر ایک باشعور اور ادب نواز نوجوان وکیل ہیں اور اپنے علاقہ کے پسماندہ لوگوں کی خدمت کرنے کی چاہ رکھتے تھے۔ آپ نے دہلی میں میرے ساتھ جموں وکشمیر سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کو منظم کرنے میں خاصہ حصہ لیا تھا۔ اور میری وجہ سے آپ پرجا سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہوگئے تھے۔ انتخاب کے دوران شری ملک عبدالرحمان اختر درہال میں بڑھتی ہوئی مقبولیت سے حکمران جماعت گھبرا گئی۔ اسلئے اختر کو شروع میں ہی حوصلہ شکن کرکے دبانے کی کوشش کی گئی۔ ریاست کے وزیراعظم وقت شری بخشی غلام محمد بھی اس حلقہ انتخاب میں گئے اور ایک عام دھمکی آمیز تقریر جھاڑ کر ووٹروں کو تنبیہ کی کہ جو لوگ نیشنل کانفرنسی امیدوار کی مخالفت اور ملک عبدالرحمان کی حمایت کریں گے ان کو سرحد پار دھکیل کر پاکستان میں پھینک دیا جائیگا۔ اختر اور ان کے حمایتی گھبرا کر پست ہمت ہوگئے اختر نے مجھے فوراً چٹھی ڈال کر ریاستی وزیراعظم کی تقریر کا حوالہ دیدیا۔ اور اپنی اور اپنے ساتھیوں کی پریشانی کا اظہار کیا۔ میں نے فی الفور اختر کو جواباً لکھا کہ حوصلہ بحال رکھ کر ڈٹے رہو تا جاتے۔ میں اپنی جان دے کر کسی کو بھی سرحد پار نہیں ہونے دوں گا۔ اگر کسی مسلمان کو سرحد پار دھکیل دیا جائے تو اس کو میری لاش پر سے ہی گزارا جائے گا۔ میں نے اختر کو یہ بھی لکھا کہ میری چٹھی کو اپنے ساتھیوں کی موجودگی میں ایک کھلے اجلاس میں پڑھا جائے تاکہ

میرا وعدہ ان تک بھی پہنچ جائے۔ اور وہ حوصلہ شکن نہ ہوں۔ آخر نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد اگرچہ آخر کو ہرا دیا گیا۔ لیکن آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے انتخابی محاذ پر زبردست مقابلہ کیا جب مجھے آخر ملاقی ہوئے۔ کہ وزیراعظم شری بخشی غلام محمد کی تقریر کے بعد وہ انتخاب سے دستکش ہونے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ لیکن میری چٹھی پڑھ کر ان کا اور ان کے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اور وہ ہمت سے انتخاب لڑنے کے قابل ہو گئے۔ لیکن پھر بھی حکومت نے دھاندلیاں کر کے کامیاب ہونے نہیں دیا۔ خیر بعد میں آخر نے آپ ہی اس کا بدلہ خود پر گرایا۔ شومیٔ قسمت دیکھئے کہ ۱۹۶۵ء کی ہند و پاک جنگ کے دوران شری ملک عبدالرحمان آخر درہال کو چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔

انتخابات کے بارے میں محاذ رائے شماری کی پالیسی ہمیشہ مبہم، غیر واضح اور حیران کن رہی ہے۔ ۱۹۶۷ء میں بھی اس جماعت نے انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ لیا تھا لیکن ایک چھوٹا گروپ انتخابات میں حصہ لینے کو فوقیت دے رہا تھا۔ اس جماعت کے جنرل سیکرٹری شری علی محمد نایک خود محاذ رائے شماری کے فیصلے کو ٹھکرا کر انتخاب لڑ بیٹھے۔ اگرچہ محاذ رائے شماری والوں نے اشتعال کی بنا پر نایک صاحب کو ہرانے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن ان کی ایک بھی نہ چلی۔ اور نایک صاحب حلقہ انتخاب ترال سے کامیاب ہو گئے۔ خواجہ غلام محمد بٹ بھی بغاوت کر کے انتخاب لڑ بیٹھے۔ اور ان کے بعد خواجہ غلام قادر مورن بھی انتخابات میں شرکت کر کے کامیاب ہو گئے۔ انہیں اور انتخابات لڑنے کے ضمن میں کچھ دوسرے ہمخیال اصحاب کو محاذ رائے شماری نے اپنی رکنیت سے خارج کر دیا ہے۔

محاذ رائے شماری کے انتخابات نہ لڑنے اور ووٹ ڈالنے سے احتراز کرنے کے باوجود بھی انتخابات ہوتے رہے۔ اور عوام بائیکاٹ کے نعرہ کو عام طور ٹھکرا کر جوق در جوق ووٹ ڈالنے نکلتے۔ اور جو ووٹ نہیں بھی ڈالتے، ان میں سے بھی کچھ ووٹ صندوقچیوں میں پڑے ہوئے ہوتے۔ جوں توں کر کے عوامی نمائندوں کا اعلان ہو جاتا، اور وزارتیں بن جاتیں لیکن شیخ صاحب اور ان کے ساتھی خواہ مخواہ کی قربانی دیتے رہے اور کچھ لوگ ان کی قربانیوں کے عوض میں مراعات حاصل کرتے رہے ہیں۔ البتہ ۱۸ اگست ۱۹۶۸ء میں اسمبلی کے جو دو ضمنی انتخابات بڈگام اور صفاکدل میں ہوئے ان میں صرف حلقہ انتخاب صفاکدل (سری نگر) میں مسٹر شیخ محمد عبداللہ کی خواہش اور محاذ رائے شماری کی اپیل بار آور ہوئی اور ووٹ ڈالنے کا بائیکاٹ ناقابل یقین حد تک ہوا۔ اس صورت

حال کو کانگریس نے پہلے ہی بھانپ کر دیدہ و دانستہ طور براہ راست اپنا کوئی امیدوار حلقہ انتخاب صفاکدل میں کھڑا نہیں کیا تھا۔ لیکن بخشی صاحب کی نیشنل کانفرنس سے نکلے ہوئے اور اسی حلقہ انتخاب میں رہنے والے شری محمد جمال کو کانگریس نے اپنا امیدوار بنالیا۔ اور ان کی ہر ممکن امداد کی۔ بائیکاٹ کا گھناونا ماحول دیکھ کر ایک آزاد امیدوار اور ٹریڈ یونین فیڈریشن کے جنرل سیکریٹری شری عبدالسلام یادہ ہو انتخاب سے دستبردار ہوگئے۔ نیشنل کانفرنس نے اس حلقہ میں شری غازی عبدالرحمان کو کھڑا کیا۔ ان دو امیدواروں کا مقابلہ ہوا۔ لیکن اکثر و بیشتر رائے دہندگان نے ووٹ ڈالنے کا بائیکاٹ کیا۔ اس حلقہ میں جو تھوڑے بہت ہندو تھے۔ ان میں سے بہتوں نے اپنے حق کا استعمال کرکے ووٹ تو ڈال دئے۔ لیکن پھر بھی کل ووٹ سینکڑوں کی تعداد میں ہی پڑے اور اس طرح سے تقریباً ۳۳ ہزار ووٹوں میں سے کل صرف بارہ سو سے کچھ اوپر ووٹ اس حلقہ میں پڑے۔ بائیکاٹ کی یہ حالت دیکھ کر الیکشن کمیشن کے حکام ششدر ہوکر رہ گئے۔ انہوں نے شری بخشی غلام محمد کو اعتماد میں لے کر دس ہزار جعلی ووٹ ڈالنے کا منصوبہ بنالیا، یہ دکھانے کیلئے کہ بائیکاٹ کا نعرہ ناکام ہوگیا۔ ان میں سے نصف ووٹ نیشنل کانفرنسی امیدوار کے حق میں اور نصف ووٹ کانگریس کے حمایتی امیدوار کے حق میں ڈالنے کی تجویز تھی لیکن بخشی صاحب نے جعلی ووٹوں کی یکجا مساوی تقسیم قبول نہیں کی۔ آپ نے شرط رکھی کہ ان ووٹوں کی بیشتر تعداد آپ کے نیشنل کانفرنسی امیدوار کے حق میں ڈالی دی جاتے۔ لیکن اس پر اختلاف پڑ گیا۔ اور بالآخر آپ کی یہ شرط منظور نہیں کی گئی۔ اس طرح سے جعلی ووٹ نہ پڑ کر نیشنل کانفرنسی امیدوار کوئی سات سو ووٹ لے کر کامیاب قرار دیا گیا۔ اسمبلی انتخابات کی ہندوستانی تاریخ میں یہ پہلی اور واحد مثال ہے کہ اتنے قلیل ووٹ پاکر ایک امیدوار کامیاب ہوگیا ہے۔

بعد میں تو خیر محاذ رائے شماری نے انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کی پالیسی پر نظر ثانی کی اور بائیکاٹ کے پرانے موقف کو بے معنی اور غلط سمجھ کر مسترد کردیا۔ اس طرح سے انتخابات میں حصہ لینے والے محاذ کے باغی افراد کی پالیسی کو درست تسلیم کرکے اپنی سابقہ پالیسی کو نادرست تصور کرلیا۔ لیکن اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کے لئے جماعت سے خارج کیے گئے باغی افراد کو واپس آنے کی دعوت نہیں دیدی۔ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کی اپنی مخالف پالیسی میں محاذ رائے شماری والوں نے حالات کی نزاکت

کے پیش نظر واضح طور پر نرمی کی جبکہ وہ ہندوستان کی سرداری اور سالمیت کو قائم رکھنے کا حلف اٹھا کر انتخابات لڑنے کیلئے تیار ہو گئے تھے۔ ایک عرصہ پہلے محاذ رائے شماری کے صدر مسٹر مرزا محمد افضل بیگ نے ریاست میں کانگریس کو ہرانے کیلئے جن سنگھ کے ساتھ بھی انتخابی گٹھ جوڑ کرنے کی رضامندی ظاہر کی تھی۔ جو اس بات کا بین ثبوت تھا کہ محاذ رائے شماری اپنے پرانے موقف سے اب بالکل ہٹ کر ہندوستان کے ڈھانچہ میں اقتدار حاصل کرنے کا متمنی ہے اور اس غرض کے لئے باقی ہندوستانی قوتوں کے ساتھ چلنے کیلئے تیار ہے۔

وادی کشمیر میں ۱۹۶۹ء میں اسمبلی کیلئے کچھ اور ضمنی انتخابات ہوئے۔ اور محاذ رائے شماری ان میں حصہ لینا چاہتا تھا۔ اس غرض سے محاذ والوں نے الیکشن کمشنر سے کچھ دیر کیلئے یہ ضمنی انتخاب ملتوی کرنے کی درخواست کی لیکن الیکشن کمشنر نے اس جماعت کے سیاسی نظریوں کی بنا پر سرد مہری دکھا کر انتخابات ملتوی نہ کئے۔ بلکہ ان سے ہندوستان کی سرداری اور سالمیت کے بارے میں وضاحت طلب کی جو

”ان سے نیک چلنی کی ضمانت طلب کرنے کے مترادف ہے۔ کمشنر نے وہ شرائط وضع کرکے اپنے حد اختیار اور دانشمندی سے تجاوز کیا ہے اس کا فیصلہ موجودہ انتخابی ضابطہ اور آئین سے تعجب انگیز عدم واقفیت کی دلالت کرتا ہے۔ ...... ریٹرننگ افسر کے پاس مطلوبہ حلف نامہ پر دستخط کرکے محاذ کے امیدواران درحقیقت اپنے آپ کو اس بات کا پابند بنائیں گے کہ وہ دانستہ طور ہندوستان کی سرداری اور سالمیت کو زک پہونچانے کیلئے کوئی حرکت یا حرف گوئی نہ کریں گے۔ اگر انہوں نے اس عہد کو توڑ دیا۔ تو وہ اپنے آپ کو نافذ شدہ قانون کی زد میں لائیں گے۔ یہ سچ ہے کہ آج تک محاذ رائے شماری کشمیر کی بنا پر ہندوستان کی سالمیت سے سخت خائف ہے۔ لیکن ان کے تسلیم شدہ انتخابی ضابطہ کی تعمیل کرنے سے ہندوستان کی سرداری اور سالمیت کو تسلیم اور اس کا احترام کرنے کا اس کو پابند بنا دینا۔ ..... یہ الیکشن کمشنر کا کام نہیں ہے کہ وہ کچھ امیدواروں کے سیاسی نظریوں کی چھان بین اور تحقیقات کرکے فیصلہ صادر کرے“ لہ

لہ اخبار ”انڈین ایکسپریس“ نئی دہلی مورخہ ۳ اپریل ۱۹۶۹ء

پنچایتی انتخابات کے وقت سے ہی محاذ رائے شماری نے اسمبلی اور پارلیمنٹ کیلئے انتخابات لڑنے کی مشق کی تھی۔ پنچایتی انتخابات میں بھی کانگریس کو وادی کشمیر میں محاذ رائے شماری کی طرف سے بڑی پریشانی اٹھانا پڑی۔ اور حکمران جماعت کو کئی جگہوں پر دھاندلیاں کرنا پڑیں۔ اس صورت حال سے حکومت اور حکمران جماعت گھبرا گئی اور آئندہ ہونے والے اسمبلی اور پارلیمنٹ کے انتخابات میں بچنے کیلئے تدابیر سوچنے لگی۔ چونکہ پارلیمنٹ کو قبل از وقت برخاست کیا گیا۔ اور شروع سنہ ۱۹۷۱ء میں ہی پارلیمنٹ کے انتخابات آن پڑے۔ اسلئے کانگریس والے مسٹر شیخ محمد عبداللہ اور محاذ رائے شماری کی جانب سے سخت مقابلہ ہونے کی تاب نہ لاکر فرار کی راہیں تلاش کرنے لگے۔ پہلے تو چیف منسٹر صادق صاحب اور ان کے دیگر حواری انتخابات میں حصہ لینے کی دعوت عام دیتے تھے۔ لیکن جب محاذ والوں نے انتخابات میں حصہ لینے کا تہیہ کیا تو حکمران جماعت کی نیندیں حرام ہوگئیں۔ اور محاذ والوں کو انتخابات لڑنے سے محروم رکھنے کے اقدامات کرنے لگی چنانچہ ان پر پہلا وار پارلیمنٹ کے انتخابات کے وقت ہوا اور مسٹر شیخ محمد عبداللہ اور مسٹر مرزا محمد افضل بیگ کو ریاست بدر کیا گیا۔

سرینگر حلقہ انتخاب کے کانگریسی امیدوار شری بخشی غلام محمد کو ہرانے کیلئے کانگریسی چیف منسٹر خواجہ غلام محمد صادق اور مسٹر شیخ محمد عبداللہ اور محاذ رائے شماری کے درمیان اشتراک ہوا۔ مسٹر شیخ محمد عبداللہ اور محاذ رائے شماری نے کسی اصول کی خاطر شری بخشی غلام محمد کے خلاف مسٹر شمیم احمد شمیم کی حمایت نہیں کی۔ بلکہ وہ صرف ذاتیات کی بناء پر شری بخشی غلام محمد کو ہرانے پر تلے ہوئے تھے۔ اسلئے اصول کی سیاست سے کہیں زیادہ ذاتیات کی سیاست خواجہ غلام محمد صادق، مسٹر شیخ محمد عبداللہ اور محاذ رائے شماری نے اپنائی۔ اور شری بخشی غلام محمد کو شکست دینے پر ان سب کی تمام کوششیں مرکوز ہوگئیں۔ اسی وجہ سے بیگم شیخ محمد عبداللہ دہلی سے وارد کشمیر ہوئیں اور جگہ جگہ جاکر بخشی غلام محمد کے خلاف انتخابی مہم تیز کی۔ جیسے صرف اسی سے صادق صاحب، شیخ صاحب اور محاذ رائے شماری کے سیاسی نصب العین کی باریابی ہوجاتی۔ اس میں شک نہیں کہ بخشی صاحب بلند قامت شخصیت ہیں۔ وہ ایک باہمت اور حوصلہ مند انسان بھی ہیں۔ کانگریسی امیدوار ہوتے ہوئے بھی بخشی صاحب نے صرف اپنے نیشنل کانفرنس کی امداد سے تنہا طور تنار

اور تیز مخالف کا مقابلہ بلند عزمی کے ساتھ کیا لیکن انتخاب ہار گئے۔

ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کی حقیقت کو تسلیم کر کے مسٹر شمیم کا انتخاب لڑنا اور پھر شیخ صاحب کی اس موقف پر ان کی بمراہ راست پر زور حمایت کرنا سیاسی حلقوں کیلئے خالی از دلچسپی امر نہ تھا۔ کچھ سیاسی حلقے اس کی یہ تاویل کرتے تھے کہ شیخ صاحب کی اس حمایت سے ان کے دو مقاصد تھے۔ ایک یہ کہ ریاست جموں و کشمیر میں ہندوستان کے بہت طاقتور علمبردار کو ذاتی رنجش کی بنا پر نیچا دکھانے کا موقع مل جائیگا۔ دوسرا یہ کہ اپنے پیروکاروں اور عقیدتمندوں کو ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کی حقیقت کو تسلیم کرانے کی طرف مائل کیا جائے اس طرح سے ان میں ہندوستان کے خلاف ابھارے گئے جذبات اور پیدا کی گئی نفرت کو ختم کر کے انہیں ہندوستان کی وفاداری میں مستقل طور رہنے کیلئے تیار کیا جائے۔ مسٹر شمیم کی حمایت ہونے پر بخشی صاحب نے بھی موخرالذکر نظریہ کی طرف اس انتخاب کے دوران اشارہ کیا تھا۔" آپ نے بتایا کہ آپ کو یقین ہے کہ شیخ عبداللہ کا تازہ فیصلہ بعد میں ایک بار پھر ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کی حقیقت کو ماننے پر مائل کرے گی" ؎۱

شیخ صاحب کے ایک پرانے عقیدتمند سردار سنت سنگھ تیغ نے دہلی میں شیخ صاحب سے صلح و مشورہ کر کے حلقہ انتخاب پارلیمنٹ بارہمولہ کے لئے کاغذات نامزدگی اس بناء پر داخل کئے کہ شیخ صاحب ان کی حمایت کریں گے لیکن شیخ صاحب نے اپنے عقیدتمند کی کوئی حمایت نہیں کی۔ بلکہ انہوں نے صرف بخشی صاحب کے خلاف سرینگر حلقہ انتخاب میں مسٹر شمیم کی اعانت کی۔ اگرچہ سردار سنت سنگھ تیغ نے شیخ صاحب کے ساتھ ٹیلیفون پر بھی رابطہ قائم کر کے وعدہ کی یاد دہانی کی۔ اور حلقہ بارہمولہ میں بیگم شیخ محمد عبداللہ سے اپنے لئے حمایت کرانے کی استدعا کی۔ لیکن پھر بھی شیخ صاحب ٹالتے رہے اور آخر میں انکاری ہو گئے جس کی بناء پر سردار سنت سنگھ تیغ کو آخری وقت پر انتخاب سے دستبردار ہونا پڑا۔ شیخ صاحب سردار سنت سنگھ تیغ کی حمایت صاف طور پر اس لئے نہ کر سکے۔ کہ اول وہ غیر مسلم ہیں۔ دوم حلقہ بارہمولہ میں جماعت اسلامی کا امیدوار شری سید علی شاہ گیلانی تھے۔ اور جماعت اسلامی کے ساتھ شیخ صاحب اس مرحلہ پر الجھ کر ایک غیر مسلم

؎۱ اخبار "انڈین ایکسپریس" نئی دہلی مورخہ ۲۵ فروری ۱۹۷۱ء

کی حمایت کرنا نہیں چاہتے تھے۔ حلقہ انتخاب سری نگر میں جماعت اسلامی کا کوئی امیدوار میدان میں نہیں تھا۔ اس لئے مسٹر شمیم کی حمایت کرنے میں شیخ صاحب کو مذکورہ بالا دو امور مانع نہیں ہوتے۔

وادی میں اسمبلی انتخابات میں محاذ رائے شماری کے مقابلے میں لڑنا کانگریس کے لئے پریشان کن امر تھا۔ اس لئے اس کی نوبت پہونچنے سے پہلے ہی محاذ رائے شماری کو ممنوع قرار دلایا گیا۔ اور اس کے ممبران کو قانوناً انتخاب لڑنے سے محروم کیا گیا۔ اس کے کچھ لیڈروں پر ریاست میں داخل نہ ہونے کی پابندی بدستور جاری ہے۔ اس طرح سے کانگریس کو کشمیر میں بچنے کی ایک اور تدبیر سوجھی۔

"مرزا بیگ نے ظاہر کیا کہ محاذ کے خلاف کارروائی اس وقت کی گئی جبکہ ہم اپنے امیدواروں کے ناموں کا اعلان کرنے والے تھے۔ جن کے سامنے حکمران جماعت کو ریاست کے کسی بھی حلقہ انتخاب میں کامیابی کا کوئی اتفاقیہ امکان تک بھی نہیں ہے۔ آئین کی منشاء اور سپرٹ کی اس بے شرمی کے ساتھ خلاف ورزی نے کشمیر میں جمہوری قدروں اور انسانی حقوق کو بالکل ختم کر دیا ہے۔" [1]

اگر محاذ رائے شماری کے افراد کو ملک کی سالمیت اور سرداری کا حلف لینے کے بعد انتخابات لڑنے کی اجازت دی جاتی۔ تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا۔ کہ وہ کئی نشستیں جیت کر یا تو واحد طور سرکار بنا لیتے یا کسی دوسری جماعت سے مل کر حکومت کی تشکیل کر لیتے تب کون سے زمین و آسمان کے قلابے مل جاتے۔ اور کون سے پہاڑ ٹوٹ پڑتے۔ صرف یہی ہوتا نا کہ کانگریس مطلق العنانہ طاقت سے کشمیر میں محروم ہو جاتی یا اس کو محاذ رائے شماری کے ساتھ وزارت بنانا پڑتی۔

"کشمیر ہندو مہاسبھا کے صدر شری لشکر ناتھ کول وکیل نے آج مانگ کی کہ چونکہ واحد تفری ٹریبونل نے شیخ عبداللہ کو رائے شماری مطالبہ کے بغیر تمام الزامات سے بری الذمہ قرار دے دیا اس لئے انہیں وادی میں داخل ہونے کی اجازت دی جانی چاہئے۔

مسٹر وکیل نے ایک بیان کے دوران کہا ہے کہ کشمیر کے لئے لگائے ہوئے

---

[1] اخبار "انڈین ایکسپریس" نئی دہلی مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۷۲ء

شیخ کے رائے شماری نعرہ کا مقابلہ ہندوستان نواز قوتیں متحدہ طور کر سکتی ہیں۔ جن کی کہ ریاست میں اکثریت ہے"۔ [۱]

ہاں ایک بات ضرور ہے کہ اب محاذ رائے شماری کا وجود بے محل اور بے معنی ہے۔ قانونی جواز کو ایک طرف چھوڑ کر اس کے قائم رہنے کیلئے اب کوئی اخلاقی جواز بھی نہیں ہے۔ اگر محاذ رائے شماری کے لوگ نیک نیتی سے ہندوستان کی سالمیت اور سرداری کا حلف لے کر ہندوستان کے دائرے کے اندر انتخابات لڑنے اور سیاسی سرگرمیاں جاری رکھنے کی دہائی دیتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ رائے شماری کا نعرہ اب رد کیا گیا ہے، تو اس جماعت کا نام بدلے ہوئے موقف کے پیش نظر بے معنی اور غلط ہے۔ اس لئے قطع نظر اس امر کے کہ محاذ رائے شماری پہ پابندی ختم کی جاتی ہے یا نہیں، اس جماعت کو فی الفور توڑ دینے کا اعلان کیا جانا چاہیے۔ اب اس جماعت کے قائم رہنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا ہے۔ بے شک نئی روپ ریکھاؤں کو دیکھ کر کسی نئی جماعت کا وجود عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ محاذ والوں کا اپنے نئے موقف کی جانب یہ ایک عملی قدم ہوگا۔ نہیں تو یہی نتیجہ اخذ ہوگا کہ مسٹر افضل بیگ اور محاذ رائے شماری کے دوسرے لیڈر اور اس کی حمایت کرنے والے مسٹر شیخ محمد عبداللہ اب بھی سیاسی ابتری اور شکستگی میں مبتلا ہیں۔ اور وہ عوام کو محض دھوکہ میں رکھ رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ کسی ہمدردی اور توجہ کے مستحق نہیں سمجھے جائیں گے۔

شیخ صاحب کو مختلف فرقوں اور جماعتوں کی طرف سے تعاون کی پیش کش بھی ہوئی تھی۔ بشرطیکہ وہ مسئلہ الحاق کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتے

"کشمیر ہندو مہاسبھا چیف لیشکر ناتھ وکیل نے کل بتایا کہ شیخ عبداللہ کو ریاستی ہندوؤں کی پوری حمایت حاصل ہو جائے گی۔ اگر وہ ۱۹۵۳ء تک والے کشمیر کے تعلقات ہندوستان کے ساتھ تسلیم کریں، جبکہ وہ ریاست کے سربراہ تھے۔

مسٹر وکیل شیخ کی اس اپیل کا جواب دے رہے تھے جو انہوں نے اقلیتوں سے ان کی حق خود ارادیت کی جدوجہد میں حمایت دینے

---

(۱) اخبار "اکنامک پوسٹ"، سرینگر مورخہ ۱۸ جون ۱۹۷۱ء

کے بارے میں کی تھی۔

آپ نے کہا کہ شیخ کیلئے اچھا ہے اگر وہ دہلی کے ساتھ تعلقات کو کشیدہ کرنے کی بجائے ریاست کے پیچیدہ سماجی و اقتصادی مسائل کو حل کرنے میں اپنی طاقت لگائیں ...... کشمیری ہمارے اپنے غیر فرقہ وارانہ میراث کو قائم رکھنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں اور شیخ اس بارے میں ان کے مکمل تعاون پہ بھروسہ کر سکتے ہیں۔ مسٹر وکیل نے کہا۔ کہ وقت کا تقاضا ہے کہ صادق وزارت کو برطرف کرنے کے بعد ریاست میں نئے سرے سے انتخابات کرائے جائیں اگر شیخ انتخابات میں حصہ لینا مان جائیں تو اس مطالبہ کو ان کی موثر حمایت مل جاتی۔ اس طرح سے کشمیریوں کو حقیقی معنوں میں اچھی اور نمائندہ حکومت مل جاتی“ [۱]

بدنظمی کو دور کرنے اور معاشی حالات کو سدھارنے کیلئے قومی ترقی پسند جماعتوں کی طرف سے بھی شیخ صاحب کو دست تعاون بڑھانے کی پیشکش ہوئی تھی۔

”جموں و کشمیر سوشلسٹ پارٹی کے سیکرٹری پیارے لال کول نے آج بتایا کہ شیخ عبداللہ کا موجودہ موقف شکستہ اور ابتر ہے۔ ان کے لئے یہ شایان شان نہیں ہے کہ وہ اپنے پرانے مقدس اعلانات سے انحراف کریں۔ آپ نے شیخ سے اصرار کیا ہے کہ وہ الحاق کا حتمی اور حقیقی ہونا تسلیم کریں۔ اور بدنظمی، مہنگائی اور بڑھتی ہوئی بے روزگاری کے خلاف لڑکر عام لوگوں کی خدمت کریں .....

آپ نے کہا۔ کہ آپ کی پارٹی اس جدوجہد میں شیخ کے ساتھ ہندوستان کے سیاسی معاشرے سے مربوط اور ناقابل جدا حصہ کے طور پر پوری تندہی سے تعاون دے گی۔ وہ عمل شروع کرکے رہنمائی کریں۔ اور ہم پیروی کریں گے“۔ [۲]

کشمیر کے مسلمانوں اور مسلم لیڈرشپ کیلئے مناسب ہے کہ وہ پوری ایمانداری

---

[۱] اخبار ہندوستان ٹائمز“ نئی دہلی مورخہ ۱۳ اپریل ۱۹۶۸ء

[۲] اخبار ہندوستان ٹائمز“ نئی دہلی مورخہ ۱۸ مئی ۱۹۶۸ء

اور پورے استحکام کے ساتھ دائمی طور ہندوستان کی قومی دھارا کے ساتھ وابستہ ہوکر اس میں مدغم ہوجائیں۔ تاکہ وہ ہندوستان کی سیکولر اور سوشلسٹ قوتوں کے ہاتھ مضبوط کرکے قومی سیاست میں ایک اہم رول ادا کرسکیں۔ اور اس طرح سے مستقبل قریب میں ترقی پرور اور جمہور نواز نیا ہندوستان تعمیر ہو۔ اسی میں کشمیر کے مسلمانوں کے مفادات مضمر ہیں۔ ان کے جو حصے یا طبقے باقی ہندوستان سے علیحدگی پسند رجحان رکھتے ہیں۔ یا کشمیر اور باقی ہندوستان کے درمیان ایک دیوار قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ چاہے یہ دیوار کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو۔ وہ اپنے لئے اور کشمیر کے لئے اس انداز فکر کے ساتھ کسی بھلائی اور بہبودی کا سبب نہیں بنیں گے۔ بلکہ ایسا وطیرہ تکلیف وپریشانی مول لینے کے مترادف ہوگا۔ اس لئے لازم ہے کہ وہ ہندوستان کے سیاسی مد وجزر میں غوطہ زن ہوکر براہ راست ترقی پسند قومی جماعتوں کے مدد لگیں۔ یہ اور بھی لازم ہے کہ ریاستی نوجوانوں کی ایک نئی اور باشعور لیڈر شپ پیدا کی جائے۔ جس کی پرواز ذہن ملک کی وسیع فضا میں ہو۔ اور گاہزنی وسعت وطن میں۔ ریاست کے سرکاری ملازمین کی بھی کئی جائز شکایتیں ہیں اور ان کے لیڈر شری عبدالمجید خان سالہا سال سے ان کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ دیگر محنت کشوں اور مزدوروں کے بھی شکوے ہیں۔ اسلئے یہ بھی لازم ہے۔ کہ کشمیر کی ٹریڈ یونین تحریک علیحدگی کے دائرے سے آگے بڑھ کر اور قومی ٹریڈ یونین تحریک میں سموکر اس کا ایک حصہ بنے۔

اس میں شک نہیں کہ وادی کشمیر کی مسلمان آبادی کا ایک خاصہ حصہ باقی ہندوستان کی کڑی کے ساتھ آگے ہی مربوط ہوچکا ہے۔ ان کا معاشی انحصار سیاحوں کی آمد و رفت اور ان سے متعلق تجارت پر ہے۔ ان میں کشتی وہوس بوٹ والے، شال دوشالے بنانے اور بیچنے والے، ایمبرائیڈری، پیپر ماشی اور ووڈ کارونگ کا کام کرنے والے اور ہوٹل چلانے والے شامل ہیں۔ کشمیر آنے والے سیاحوں میں ہر سال بیشتر تعداد ملک کے باقی حصوں سے آنے والے سیاحوں کی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ پھیری والوں کی خاصی تعداد ہے۔ جو ہر سال سردیوں میں ملک کے مختلف حصوں میں گھوم گھام کر مال بیچ دیتے ہیں۔ اور اچھی کمائی کرکے موسم بہار میں یہاں واپس لوٹتے ہیں۔ کشمیر کی اتنی آبادی کا یہ ناقابل تنسیخ رشتہ اب ہندوستان کے باقی حصوں کے ساتھ سالہا سال سے چلا آرہا ہے۔ ان طبقوں کے علاوہ ایسے بھی بہت سے لوگ ہیں۔ جو سیاسی عقائد، نظریاتی ہم آہنگی اور دیگر ٹھوس

وجوہات کی بنا پر ہندوستان کے ساتھ وابستہ ہیں اور ہندوستان کو اپنا وطن سمجھ کر کشمیر کو اس کا ناقابل جُدا حصہ تصور کرتے ہیں۔ اور آزاد ہندوستان کے آزاد شہریوں کی طرح آئین ہند کے بنیادی حقوق نامہ سے فیضیاب ہوتے ہیں۔

مسٹر شیخ محمد عبداللہ کشمیر کے تمام فرقوں کو اپنے ساتھ لے جاکر کشمیر کیلئے دائمی امن اور فارغ البالی کی راہ نکال سکتے ہیں۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ کانگریسی راج میں فرقہ وارانہ کشیدگی کشمیر میں پیدا ہو گئی تھی۔ اور اس کا سب سے بڑا واقعہ ۱۹۶۷ء میں کماری پرمیشوری کا ہو گزرا ہے۔ جو تبدیلیٔ مذہب اور نکاح کے بعد پروین اختر کے نام سے مشہور ہو گئی ہے۔ یہ واقعہ صادق صاحب کے عہد وزارت میں ہوا۔ اس واقعہ کے سلسلے میں مجھے بھی گرفتار کرکے جیل بھیج دیا گیا تھا۔ بہرحال میں اس کے حسن و قبح پر یہاں کچھ لکھنا نہیں چاہتا ہوں۔ البتہ اتنا کہے دیتا ہوں کہ محبت کے سامنے سماجی فصیلیں اور مذہبی دیواریں مسمار ہو جاتی ہیں اور کجکلاہوں کے سر جھک جاتے ہیں۔ لیکن شکوک کو بڑھانا اور پھر سیاسی اغراض کیلئے استعمال کرنا قابل مذمت ہے۔ اس واقعہ کے کچھ مدت بعد جب شیخ صاحب کشمیر تشریف لے آئے تو انہوں نے اس بارے میں دانش مندانہ تقریر کرکے بہت سے زخمی دلوں پر پھاہا رکھا۔ وادیٔ کشمیر میں رہنے والے ہندو اپنی جان اور عزت کانگریسی سرکار سے کہیں زیادہ مسٹر شیخ محمد عبداللہ کے ہاتھوں میں محفوظ تصور کرتے ہیں۔ کشمیر میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے کئی اور ستون بھی ہیں۔ جن میں صدرالدین مجاہد، شری غلام محی الدین قرہ، مولانا محمد سعید مسعودی شری غلام محمد بٹ وغیرہ شامل ہیں۔ مسٹر شیخ محمد عبداللہ نے پرمیشوری کے واقعہ کے بعد ایک دفعہ آثار شریف حضرت بل میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ کشمیر کے ہندوؤں کی حفاظت ہندوستانی فوج نہیں کر سکتی ہے۔ اور اگر ان کا کوئی تحفظ کر سکتا ہے تو وہ فرزندان توحید ہیں۔ اور آنحضرتؐ کی یہی فوج ان کی محافظ ہے۔ اگرچہ کشمیر میں رہنے والے ہندوؤں کیلئے مسٹر شیخ محمد عبداللہ کی یہ ایک ناواجب وارننگ تھی لیکن پچھلے کئی برسوں نے یہ احساس دلایا کہ اگر کشمیری ہندوؤں کو جان و عزت کا خطرہ پیدا ہوتا ہے۔ تو وہ کانگریسی سرکار کی جانب سے ہی ہوتا ہے۔ اسلئے ہندوؤں میں ایک رجحان پیدا ہو رہا ہے۔ کہ کانگریسی سرکار کی نسبت کشمیر کے ہندوؤں کی جان بخشی کی ضمانت مسٹر شیخ محمد عبداللہ کی ذات ہے۔

• شیخ صاحب اپنی موجودگی میں یہاں کے بگڑے ہوئے امن و انتظام کو انفرادی حیثیت میں بھی درست کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ریجنل انجینیئرنگ کالج نسیم باغ سرینگر میں طلباء کے دو فرقوں کے درمیان جو تصادم ۳۱ر مئی ۱۹۶۸ء کو ہوا تھا اور جس کی وجہ سے ایک طالب علم مسمی محمد مقبول حاشیہ جان بحق بھی ہو گیا تھا اور جس کے نتیجہ میں حالات چشم زدن میں تشویشناک بن گئے تھے اور دیکھتے دیکھتے سازشی عنصر کی وجہ سے سارا شہر سرینگر اس آگ کی لپیٹ میں آنے لگا تھا لیکن شیخ صاحب کی بروقت پہل کرنے سے امن و انتظام قائم ہو گیا۔ میں نے اس بارے میں ایک مضمون کل ہند پرجا سوشلسٹ پارٹی کے ترجمان انگریزی ہفتہ وار "جنتا" بمبئی میں لکھا تھا۔ جس میں درج تھا:-

"حالات اگرچہ چند ہی لمحوں میں خطرناک بن گئے لیکن شیخ عبداللہ کی کوششوں سے معمول پر آگئے۔ آپ نے اس منظم بدامنی کی روک تھام کی اور کشمیر کو شعلہ بار ہونے سے بچا لیا۔ آپ نے عوام کو خبردار کیا کہ حکومت کی شہ پر مفاد خصوصی رکھنے والے کچھ حلقے اس گڑبڑ کے پیچھے ہیں۔ آپ نے پرائیویٹ بس ڈرائیوروں کو بسیں چلانے کو کہا تاکہ حضرت بل وغیرہ کے لئے معمول کا ٹریفک پھر سے شروع ہو جائے۔ اس ضمن میں شیخ کے سامنے جو بھی وجوہات تھیں لیکن یہ بات تو صاف ہے کہ آپ نے نازک وقت پر وہ شاندار کام کیا جو کہ حکام بھی نہ کر سکے" [1]

---

[1] ہفتہ وار "جنتا" بمبئی مورخہ ۱۴ر جولائی ۱۹۶۸ء